قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا تہترواں سال

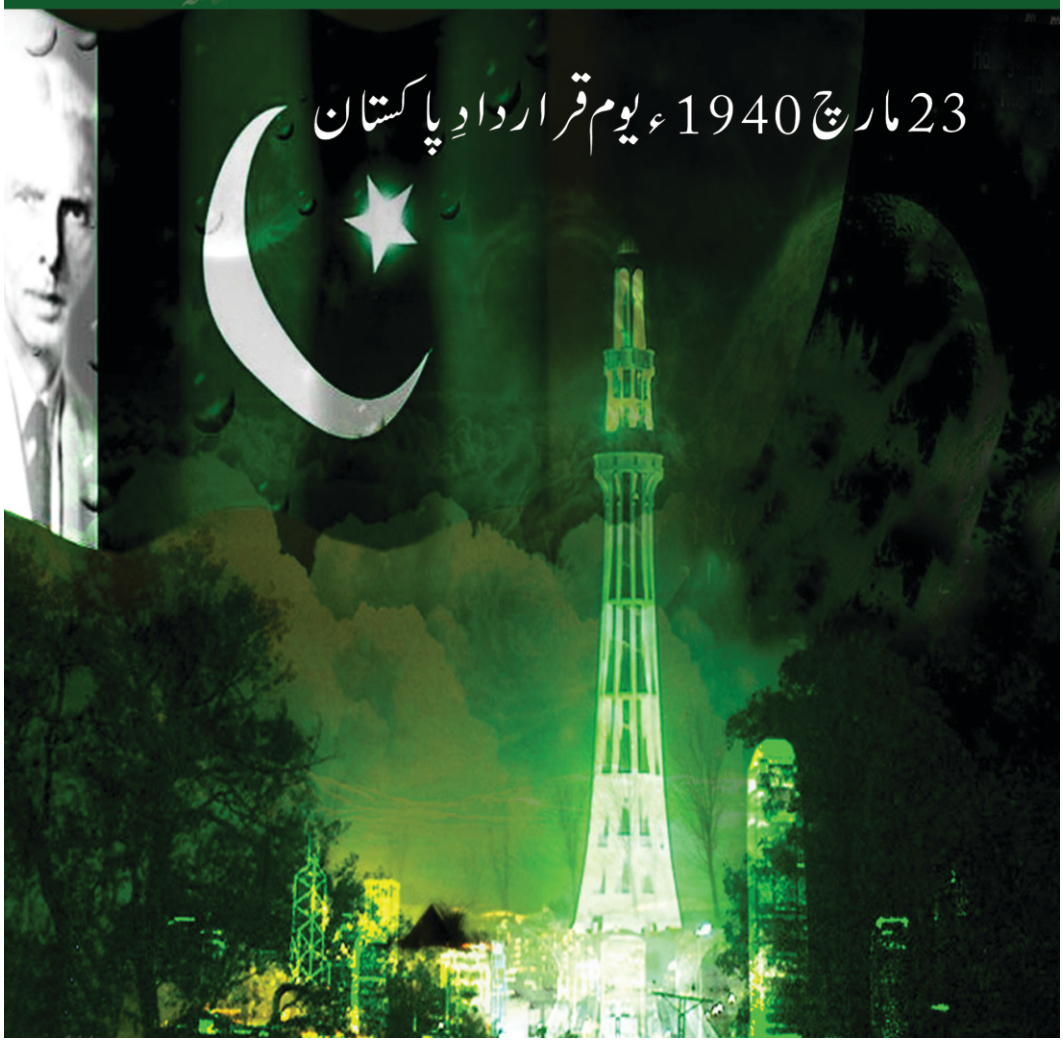
ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

مارچ 2016ء

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ



جلد 69 | شمارہ نمبر 03 | مارچ 2016ء

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

ناشر و چیئرمین: محمد اکرم راٹھور

مجلسِ ادارت: ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر منظور الحق، خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

زرِ تعاون	50 روپے فی پرچہ
پاکستان	-/550 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک	-/800 روپے سالانہ
بیرون ملک	-/2500 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک	-/4000 روپے سالانہ

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات	ادارہ	4
پرویز صاحب کا نظریۂ اسلامی مملکت (قسط ششم)	منظور حسین لیل	8
ایک نابغۂ روزگار کی رحلت	ڈاکٹر عائشہ صدیقہ	16
قرآنی معاشرہ	عمر احمد عثمانی مرحوم	20
طریق کار	پرویز صاحب	24
تخلیق دار تقائے کائنات۔۔۔	ڈاکٹر سنبل	38
تحریک طلوعِ اسلام اقامتِ دین کی ایک واحد تحریک	خواجہ ازہر عباس	42
طلوعِ اسلام کا تعارف	پرویز صاحب	52

ENGLISH SECTION

Surah *Al-Takwir* (الانفطار) – *Durus-al-Qur'an* By G.A.Parwez
Parah 30: Chapter 16 Translated by: Dr. Mansoor Alam 59

Bank Account Idara Tolu-e-Islam

For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465-22-003082-7

For International Transactions
IBAN: Pk21 NBPA 0465 0022 0003 0827
Swift Code : NBPAPKKAA02L

National Bank of Pakistan Main Market, Gulberg Lahore

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ادارہ طلوعِ اسلام 25-B گلبرگ نمبر 2، لاہور۔ 54660، (پاکستان) فون: 042-35714546
idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر 25-B، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

بیا ساقی نوائے مرغِ زار از شاخسار آمد
بہار آمد نگار آمد قرار آمد
کشید ابر بہاری خیمہ اندر وادی و صحرا
صدائے آبشاراں از فرازِ کوہسار آمد
سرت گردم تو ہم قانونِ پیشیں ساز دہ ساقی
کہ خیل نغمہ پردازاں قطار اندر قطار آمد
کنار از زاہداں برگیر وبیباکانہ ساغر کش
پس از مدت ازیں شاخِ کہن بانگ ہزار آمد
بہ مشتاقاں حدیث خواجۂ بدر وحنین آور
تصرف ہائے پنہانش بچشمم آشکار آمد
دگر شاخِ خلیلؑ از خونِ ما نم ناک می گردد
ببازارِ محبت نقد ما کامل عیار آمد
سر خاکِ شہیدے برگہائے لالہ می پاشم
کہ خونش با نہالِ ملت ما سازگار آمد
''بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم وطرحِ دیگر اندازیم''

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

23 مارچ

یوں تو ہر دن اللہ ہی کا ہوتا ہے لیکن بعض دنوں میں اس قسم کے عظیم الشان انقلاب واقع ہوتے ہیں کہ قرآن انہیں ''ایام اللہ'' کہہ کر پکارتا ہے۔ اسی طرح قوموں کی زندگی میں بعض دن ایسے آتے ہیں جن میں ان کا کاروان حیات ایک نیا موڑ مڑتا ہے اور اس سے ان کی قسمت کا پانسہ پلٹ جاتا ہے۔ اس قسم کے دن قوموں کی زندگی میں یادگار بن جاتے ہیں اور تاریخ کے اوراق میں درخشندہ حروف میں لکھے جاتے ہیں مسلمانانِ ہندو پاکستان کی حیات ملی میں گذشتہ پچیس سال کے عرصہ میں کئی دن ایسے آئے ہیں جن کی یاد کو تاریخ اپنی آغوش میں محفوظ رکھے گی۔ ان میں سب سے پہلا یادگار دن 29 دسمبر 1930ء کا تھا جب الہٰ آباد کے مقام پر مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں، حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے اپنا وہ خطبۂ صدارت ارزانی فرمایا جس نے فی الحقیقت اس قوم کے مستقبل کے دھارے کا رخ بدل دیا۔ اس سے پہلے مسلمانانِ ہند ایک راہ گم کردہ قافلے کی طرح پریشان و سرگرداں، ادھر ادھر مارے مارے پھرتے تھے۔ ان کے پاؤں اٹھتے تھے لیکن نہ سراغ راہ ان کے سامنے تھا نہ نشانِ منزل۔ وہ ہر دور سے نظر آنے والے غبار کی طرف لپک کر بڑھتے تھے کہ شاید اس میں وہ ''شہ سوارِ اشہبِ دوراں'' ہو جو انہیں صحیح و سلامت منزل مقصود تک لے جائے لیکن اس کے بعد مایوس ہو کر بیٹھ جاتے تھے کہ وہ غبار، بگولے کے رقص سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا تھا۔ اس تشتت و انتشار اور یاس و حزن کے عالم میں اس حکیم الامت نے جسے قرآنی بصیرت نے دیدۂ انجم عطا فرمایا تھا، ان پراگندہ افرادِ کارواں کو پکارا اور نہایت حکمت و تدبر اور شفقت و محبت سے انہیں بتایا کہ ان کی منزل مقصود کیا ہے اور اس تک پہنچنے کا صحیح راستہ کونسا۔ انہوں نے سب سے پہلے اپنے مخاطبین سے کہا کہ:

> آپ نے مسلم لیگ کے اس اجلاس کی صدارت کے لئے اس شخص کو منتخب کیا ہے جو اسلام کے مستقبل سے مایوس نہیں۔ اسے پورا پورا یقین ہے کہ اسلام میں وہ قوت موجود ہے جو انسان کو اس کی تنگ نظری سے نجات دلا سکتی ہے جسے جغرافیائی حدود نے پیدا کر دیا ہے۔ جس کا ایمان یہ ہے کہ ایک فرد یا مملکت کی زندگی میں مذہب کی قوت بے حد اہمیت رکھتی ہے۔ اور جو (اس حقیقت پر علیٰ وجہ البصیرت) یقین رکھتا ہے کہ اسلام اپنی تقدیر آپ ہے۔ اس لئے دنیا کا کوئی حادثہ اسے تباہ نہیں کر سکتا۔

اس کے بعد انہوں نے فرمایا کہ یہ تمہاری غلط نگہی ہے جو تم نے سمجھ رکھا ہے کہ مسلمانوں کی قومیت وطن کی حدود سے متشکل ہوتی ہے۔ ان کی قومیت کا مدار اسلام پر ہے۔

جس نے جذبات اور وفاشعاریوں کے وہ بنیادی اصول عطا کئے ہیں جو رفتہ رفتہ پراگندہ افراد اور منتشر گروہوں میں یک جہتی اور یک نگہی پیدا کر کے انہیں آخرالامر ایک متعین قوم میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

قومیت کی ان نئی بنیادوں کی وضاحت کے بعد، وہ مسلمانانِ ہند کے مستقبل کو سامنے لائے اور کہا کہ:

میں چاہتا ہوں کہ پنجاب۔ صوبہ سرحد۔ سندھ اور بلوچستان کو ایک دوسرے میں مدغم کر کے ایک مملکت بنالیا جائے۔

انہوں نے اپنی اس آواز کے اظہار تک ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ایمان و ایقان کی ایک ایسی آواز کے ساتھ جو دل کی گہرائیوں سے ابھرا کرتی ہے، پورے حتم و یقین سے فرمایا کہ:

حکومت برطانیہ کے دائرہ کے اندر رہ کر ہو یا آزادانہ طور پر۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ ہندوستان کے شمال مغربی علاقہ میں مسلمانوں کی ایک مستحکم اور متحدہ مملکت کا قیام ان کے لئے مقدر ہو چکا ہے۔

یہ تھا نشانِ منزل (یعنی ہندوستان کے شمال مغربی علاقہ میں مسلمانوں کی ایک متحدہ مملکت کا قیام) اور وہ تھا سراغِ راہ (یعنی وطنی، نسلی، لسانی نسبتوں سے بلند ہو کر، محض اسلام کی بنیادوں پر مسلم قومیت کی تشکیل) جو 29 دسمبر 1930ء کو اس پراگندہ فکر اور افسردہ خاطر قوم کے سامنے رکھا گیا۔ یہ دن، فی الحقیقت مسلمانانِ ہندوستان کی زندگی میں، ہمیشہ زندہ و تابندہ رہنے والا دن تھا۔

چونکہ ہر انقلابی آواز کی طرح یہ آواز بھی اپنے زمانے سے بہت آگے تھی اس لئے کسی نے اسے سنجیدگی سے درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ لیکن زمانے کے تقاضے قوم کو کشاں کشاں اسی طرف لئے جا رہے تھے۔ انہی تقاضوں نے ان میں قائداعظمؒ جیسی شخصیت کو ابھار دیا۔ انہوں نے سب سے پہلے، قومیت کے اس ''جدید'' تصور کے ماتحت، مسلمانانِ ہند کو ایک جداگانہ ملت کی حیثیت سے منظم کیا اور اس کے بعد ان میں اس منزل کے شعور کو بیدار کیا جس کا نشان اقبال نے 1930ء میں دیا تھا۔ چنانچہ چند ہی سال کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس قوم نے 23 مارچ 1940ء کو، اسی حکیم الامتؒ کے مرقد کے سرہانے کھڑے ہو کر اپنے اس عزم کا اعلان کیا کہ ہم ہندوستان میں اپنی جداگانہ مملکت کو قائم کر کے رہیں گے۔ یہ دن اس قوم کی کتابِ زندگی میں ستاروں کی روشنائی میں لکھے جانے کے قابل ہے۔

اس عزم کے بعد، اس منزل تک پہنچنے کے لئے مسلسل جدوجہد جاری رہی تا آنکہ انہیں نہ صرف شمال مغربی بلکہ اس کے ساتھ ہی شمال مشرقی ہند میں بھی ایسا خطۂ زمین مل گیا جس میں یہ اپنے تصورات کے مطابق اپنی آزاد مملکت قائم کر سکتے تھے۔ یہ انقلاب عظیم 14 اگست 1947ء کو واقع ہوا۔ یہ دن ان کی حیاتِ ملی میں ہزاروں مسرتوں اور لاکھوں شادمانیوں کا پیامبر تھا اور بلاشائبہء

تشکیک‘ قرطاسِ ارض پر سورج کی کرنوں سے مرصع کاری اور زرنگاری کا مستحق۔ اس طرح سترہ سال کے قلیل عرصہ میں (جو قوموں کی زندگی میں پلک جھپکنے سے زیادہ کا عرصہ نہیں کہلا سکتا) ایک ’’شاعر کا خواب‘‘ خواب یوسف کی طرح‘ حقیقت ثابتہ بن کر سامنے آ گیا۔

لیکن جہاں ایک طرف‘ اس قوم کی قسمت کے ستارے یوں ایک ایک کر کے بیدار ہوتے جا رہے تھے‘ تاریکی کا ایک گوشہ بھی اس کے ساتھ چلا آ رہا تھا کہ اقبالؒ نے پاکستان کا تصور دیا لیکن قبل اس کے کہ یہ حقیقت منتظر‘ لباس مجاز میں سامنے آ جائے‘ وہ ہم سے رخصت ہو گیا۔ پھر جناحؒ نے وہ خطۂ ارض حاصل کر لیا جس میں اس جدید مملکت کو متشکل ہونا تھا لیکن قبل اس کے کہ اس کی بنیادیں اس نقشے کے مطابق استوار ہوں۔ وہ بھی ہمیں الوداع کہہ گیا۔ اب قوم کے برسر اقتدار طبقہ کی حالت ان رئیس زادوں کی سی ہو گئی جنہیں بیٹھے بٹھائے ایک ریاست ورثہ میں مل جائے۔ اور عوام کی حالت ان یتیموں کی سی جن کا کوئی والی وارث ہی نہ رہے۔ چنانچہ اس عرصہ میں‘ اوپر کے طبقے نے اس مفت میں ملی ہوئی ریاست کا جو کچھ حشر کیا اور نیچے کے طبقے کے ساتھ جو کچھ بیتی اس کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے کہ:

فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا وَّلْيَبْكُوا كَثِيرًا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُوْنَ (9:82)

انہوں نے جو کچھ اپنے ہاتھوں سے کیا ہے‘ انہیں چاہئے کہ اسے دیکھ کر روئیں بہت زیادہ اور ہنسیں بہت کم۔

اقبال نے تخلیق پاکستان کی اہمیت یہ بتائی تھی کہ:

ہندوستان میں‘ بہ حیثیت ایک ثقافتی قوت کے‘ اسلام کی زندگی کا دارومدار اس پر ہے کہ اسے ایک خاص خطہ میں مرکوز کر دیا جائے۔

اس کے بعد انہوں نے کہا تھا کہ ’’یہ خطۂ زمین بیرونی حملہ آوروں کی مدافعت کا ذریعہ بن جائے گا خواہ وہ حملے توپ و تفنگ کے ہوں اور خواہ نظریات و تصورات کے۔‘‘ اس کے بعد انہوں نے کہا تھا کہ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ:

اس سے اسلام کو اس کا موقع مل سکے گا کہ وہ اپنے آپ کو ان اثرات سے پاک اور صاف کر لے جنہوں نے اسے عربی ملوکیت کے زمانے میں ملوث کر دیا تھا۔ یہ اپنی تعلیم‘ اپنی ثقافت اور اپنے قوانین کو ایک طرف حقیقی اسلام سے اور دوسری طرف دور حاضرہ کے تقاضوں سے قریب تر کر سکے گا۔

یہ تھے وہ فوائد جو اسلام کو اس صورت میں حاصل ہونا تھے جب شمال مغربی خطہ ایک واحد مملکت بن جاتا۔ اب جبکہ ہم نے شمال مغربی خطہ کو ایک مملکت بنا لیا ہے‘ ہمارے پیش نظر ان مقاصد کا حصول ہونا چاہئے۔ یعنی ہم اس خطۂ زمین میں ایسا معاشرہ قائم کریں جو حقیقی اسلام (یعنی قرآن) کے اصولوں پر متشکل ہو اور ان اصولوں کی روشنی میں ہم ایسے جزئی قوانین مرتب کریں جو دور حاضر کے تقاضوں کو کما حقہٗ پورا کر سکیں۔ اسی سے اسلام ان غیر اسلامی عناصر سے منزہ ہو سکے گا جو ہمارے

دورِ ملوکیت کی یادگار ہیں اور جنہیں ہم غلط فہمی سے ہزار برس سے (حقیقی اسلام سمجھ کر) سینے سے لگائے پھر رہے ہیں اور اسی سے ہمارا دین ایک زندہ قوت بن کر دنیا میں ہماری حفاظت اور صیانت کا ذمہ دار بن جائے گا۔ اس لئے کہ (اقبال کے الفاظ میں) تاریخ کے نازک ادوار میں' اسلام نے مسلمانوں کو بچایا ہے۔ مسلمانوں نے اسلام کو نہیں بچایا۔''

اقبالؔ نے اپنے مذکورۂ بالا خطبہ میں یہ بھی بتایا تھا کہ ہمارے زوال کی دو علتیں بالکل نمایاں ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم میں صحیح ٹائپ کے لیڈر نہیں۔

لیڈر سے میری مراد ایسے افراد ہیں جو اپنی خداداد بصیرت یا تجربہ کی بنا پر' اسلام کی روح اور اس کی غایت سے پوری طرح واقف ہوں اور دوسری طرف عصرِ حاضر کے تقاضوں کا بھی صحیح صحیح احساس رکھتے ہوں۔ اس قسم کے افراد درحقیقت قوم کے لئے ''خدائی قوت'' کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ خدا کی طرف سے بنے بنائے ملتے ہیں۔ آرڈر دے کر بنوائے نہیں جا سکتے۔

دوسری علت انہوں نے یہ بتائی تھی کہ ہماری قوم میں ''ملی شعور'' کی کمی ہوتی جا رہی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص اپنے اپنے ذاتی مفاد کے پیچھے پڑا رہتا ہے اور ملت کے تعمیری کاموں کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے ہاں اس وقت کوئی لیڈر بھی ان خصوصیات کا حامل نہیں جس کی طرف اقبال نے اشارہ کیا ہے۔ جو لوگ فضا میں خلا کی وجہ سے مذہبی پیشوائیت کی مسندوں پر متمکن ہو گئے ہیں اور زمامِ اقتدار اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں انہیں نہ اس کا علم ہے کہ اسلام کی روح اور غایت کیا ہے اور نہ ہی اس کا شعور کہ عصرِ حاضر کے تقاضے کیا۔ لیکن اس کمی کو اس طرح پورا کیا جا سکتا ہے کہ ہم باہمی مشاورت سے اپنے تمام معاملات میں قرآن سے راہنمائی حاصل کریں اور اس کی روشنی میں عصرِ حاضر کے پیش کردہ مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کوشش میں ہم کسی جگہ غلطی بھی کر جائیں۔ لیکن غلطیوں سے کبھی گھبرانا نہیں چاہئے۔ مزید تجربہ غلطیوں کی اصلاح خود بخود کر دیا کرتا ہے۔ باقی رہی قوم میں ملی شعور کی بیداری' سو اس کی واحد صورت وہی ہے جسے قرآن نے بطور اصل الاصول پیش کیا ہے۔ یعنی انفرادی مفاد کو کم از کم کر کے ملی مفاد کو زیادہ سے زیادہ کر دیا جائے۔ بالفاظ دیگر' رزق کے سرچشموں کو انفرادی ملکیت سے نکال کر ملت کی اجتماعی تحویل میں دے دیا جائے تاکہ وہ انہیں تمام افرادِ ملت کی نشوونما کے کاموں میں صرف کر سکے۔ قرآن نے اقوام کی تخلیق اور نشاۃ ثانیہ کا ایک اہم اصول بتایا ہے اور وہ یہ کہ پوری کی پوری قوم ایک فرد واحد کی حیثیت سے زندگی بسر کرے۔ مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ؕ (31:28) - اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ رزق کے سرچشموں میں افراد کا الگ الگ مفاد نہ رہے بلکہ پوری ملت کا مفاد مشترکہ ہو اور اس کے بعد کسی کے دل میں قطعاً یہ خیال نہ پیدا ہو کہ وہ سندھی ہے یا پنجابی۔ بلوچی ہے یا سرحدی۔ اگر اسلام لانے کے بعد بھی' امتیازاتِ رنگ و بو کے یہ بت ہمارے دلوں میں قائم رہے تو سمجھ لیجئے کہ ہمارے دلوں میں ایمان نے گھر نہیں کیا۔ ہم بدستور مشرک کے مشرک ہیں۔

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا (76:3)

ملک منظور حسین لیل۔ بھکر
0332-7636560
mhleeladv@yahoo.com

(قسط ششم)

پرویز صاحب کا نظریۂ اسلامی مملکت

(قرآنی حکومت)

اور جو لوگ ماانزل اللہ (قرآن) کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے، وہی لوگ کافر، ظالم، فاسق ہیں (5:44-45-47)

نظامِ سیاست

دوایوانی مقننہ:

ایسی صورت میں پرویز صاحب دوایوانوں پر مشتمل پارلیمان تجویز کرتے ہیں کیونکہ:۔ ''قوم میں بہرحال، عام علمی اور ذہنی سطح کے افراد بھی ہوں گے اور خاص صلاحیتوں کے مالک افراد بھی۔ مجلسِ مشاورت میں ان دونوں کی نمائندگی ضروری ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے پارلیمان کا دوایوانوں پر مشتمل ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا پارلیمان دوایوانوں پر مشتمل ہوگی۔ ایک ایوان، عام ابنائے ملت پر مشتمل اور دوسرا خاص صلاحیتوں کے اہل، اعیانِ اُمت پر۔'' (طلوعِ اسلام ستمبر 1977ء، ص:15)۔ یہی تجویز پرویز صاحب نے جنوری 1971ء کے طلوعِ اسلام میں بھی دی تھی۔ اگر انتخابات آمدنی کی بنیاد پر کرائے جائیں تو:۔۔۔ ''ایسی شکل میں پارلیمان دوایوانوں پر مشتمل ہونی چاہیئے۔ یہ (آمدنی کی بنیاد پر مشتمل) ایوانِ زیریں ہوگا۔ ایوانِ بالا ملک کے اربابِ فکرونظر، اصحابِ دانش وبینش اور ماہرینِ علوم وفنون پر مشتمل ہوگا۔ اس میں (مثلاً) فوج کے ریٹائرڈ کمانڈران چیف اور جرنیل، مختلف ادوار کے صدرِ مملکت اور وہ وزراء جن کا کردار بے داغ رہا ہے، ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے جج صاحبان اور شفاف کردار کے سابقہ گورنرز، پروفیسرز، ڈاکٹرز، ماہرینِ قانون، ماہرینِ صنعت وحرفت، نیز ملک کے سکالرز وغیرہ اس ایوان کے ارکان قرار دیئے جائیں۔۔۔ اس طرح، علاوہ اس کے کہ مملکت ان اربابِ فکرونظر کی ذہانت، صلاحیت اور تجربہ سے مستفید ہوسکے گی، ایک منفعت بخش پہلو یہ بھی ہوگا کہ معاشرہ میں ان حضرات کو عزت کا مقام حاصل ہوجائے گا۔ اور یہ معاش کی طرف سے بھی بے فکر ہوجائیں گے۔۔۔ ذرا سوچئے کہ ایسے لوگ جن کے سینوں میں مملکت کے بلندترین راز ہوں، اگر ریٹائرمنٹ کے بعد گمنامی کے گوشے میں دھکیل دیئے جائیں

یا انہیں ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کے لئے مختلف دروازوں پر دستکیں دینی پڑیں تو ان میں لغزش کے کتنے امکانات ابھر سکتے ہیں۔عزت سے محرومی اور تنگ دستی بڑی سخت آزمائش ہوتی ہے۔''طلوعِ اسلام فروری 1973ء،ص:50۔''جہاں تک خصوصی مفادات کا تعلق ہے ان کے لئے ایک ایوانِ بالا (Senate) کا ہونا ضروری ہے۔خصوصی مفادات سے ہماری مراد ہے مثلاً ڈاکٹر،وکلاء جج صاحبان،اساتذہ۔اہلِ قلم، سائنٹفک تحقیقات کے ماہر،صنعت وحرفت،تجارت و زراعت وغیرہ۔ان کے لئے وہی حلقے ہوں وہی ووٹ دینے والے اور انہی میں سے امیدوار۔ایوانِ زیریں اور ایوانِ بالا کے باہمی تعلقات اور دوائرِ اختیار کا فیصلہ آئینی طور پر کیا جا سکتا ہے۔(اکتوبر 67ء)۔''

غیر مسلموں کی پوزیشن:۔اسلامی مملکت میں رہنے والے غیر مسلم افراد کا معاملہ قرآن کریم کے پیش کردہ دوقومی نظریئے (62:2) کی روشنی میں طے کیا جائے گا۔چونکہ غیر مسلم افراد کو اسلامی مملکت کے امورِ حکومت میں شریک نہیں کیا جا سکتا،لہٰذا وہ بطور حزبِ اختلاف بھی اس مملکت کی پارلیمان کے ممبر نہیں بن سکتے۔۔۔طلوعِ اسلام ستمبر 1977ء کا صفحہ نمبر 13 ملاحظہ ہو:۔''اس (دوقومی نظریہ) کا عملی اور فطری نتیجہ یہ ہے کہ غیر مسلم قانون سازی کے امور میں حصہ نہیں لے سکتے۔اس لئے اسلامی مملکت کی مجلسِ قوانین ساز صرف مسلمانوں پر مشتمل ہوگی۔''محمد (ﷺ) کی پارلیمان میں ابوجہل کا کیا کام؟''طلوعِ اسلام جون 1977ء میں صفحہ نمبر 22 پر''غیر مسلموں کی پوزیشن''اور اس پر ہونے والی تنقید کے بارے میں پرویز صاحب وضاحت کرتے ہیں:۔''اسلامی نظام کے تحت رہنے والوں کو مذہبی آزادی تو حاصل ہوگی لیکن انہیں شریکِ حکومت نہیں کیا جائے گا۔عصر حاضر میں قومیت کی تشکیل،وطن یا نسل کے اشتراک سے کی جاتی ہے۔بالخصوص وطن کے اشتراک سے۔یعنی ایک ملک کے بسنے والے تمام افراد،بلاتمیز مذہب ایک قوم بن جاتے ہیں۔لیکن اسلامی نظام میں،قوم کی تشکیل،آئیڈیالوجی کی بنیاد پر ہوتی ہے۔یعنی جو لوگ اسلامی آئیڈیالوجی کو تسلیم کریں وہ ایک قوم کے افراد،اور جو لوگ اس آئیڈیالوجی پر ایمان نہ رکھیں،وہ اس قوم کے دائرے سے باہر،خواہ وہ اسی ملک میں کیوں نہ بستے ہوں۔قرآن کریم نے نوعِ انسان کی تفریق اسی معیار کے مطابق کی ہے:۔هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ؕ (64:2)۔اللہ وہ ہے جس نے تم (تمام انسانوں) کو پیدا کیا۔سو تم میں سے کچھ کافر ہیں اور کچھ مومن۔وہ اپنی آئیڈیالوجی کی دعوت کو عام کرتا ہے۔یعنی وہ اس دعوت کو دنیا کے تمام انسانوں کے سامنے بلالحاظ رنگ،نسل،وطن،زبان،مذہب یکساں طور پر پیش کرتا ہے۔اور ان سے کہہ دیتا ہے کہ وہ اس آئیڈیالوجی پر خود غور وفکر کریں اور اس کے بعد،اگر علیٰ وجہ البصیرت اور بطیبِ خاطر (یعنی دل اور دماغ کی رضامندی سے) سمجھیں کہ یہ آئیڈیالوجی ان کے لئے قابلِ قبول ہے،تو اسے قبول کر لیں اور اگر ایسا نہ سمجھیں تو اسے مسترد کر دیں۔۔اس سے قرآن کریم نے،اسلامی ملت میں شامل ہونے اور اسلامی مملکت میں شریکِ کار بننے کے لئے دروازہ کھلا

رکھا ہے کہ جس کا جی چاہے اس کے اندر داخل ہو جائے: فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّهٖ سَبِیْلًا (73:19)۔ ''جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف جانے کا راستہ اختیار کر لے۔'' اس ''اذنِ عام'' کے بعد اگر کوئی شخص اس کے اندر آنا نہیں چاہتا تو وہ اپنے عمل کا آپ ذمہ دار ہے۔ سورہء فاطر میں اس حقیقت کو واضح الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے جہاں کہا ہے کہ: هُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ ؕ ''اللہ وہ ہے جس نے تمہیں زمین میں حکومت عطا کی ہے۔'' فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَیْهِ كُفْرُهٗ ؕ۔ اگر کوئی شخص اس آئین و دستور کو نہیں مانتا جس پر اس حکومت کی عمارت استوار ہے تو اس کے لئے وہ خود ذمہ دار ہے۔ اس آئینِ مملکت (اسلامی آئیڈیالوجی) کو تسلیم نہ کرنے سے اگر وہ کسی قسم کے مفاد سے محروم رہتا ہے تو اسے اس کی شکائت نہیں کرنی چاہیئے۔ اس لئے کہ خود کردہ را علاجے نیست۔ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَیْهِ كُفْرُهٗ ؕ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص کسی آئیڈیالوجی کو تسلیم نہ کرے لیکن اسے تسلیم کرنے والوں کو جو مفاد حاصل ہیں، ان میں برابر کا شریک ہونا چاہے۔ (واضح رہے کہ یہ مفاد ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے کا فطری نتیجہ ہوتے ہیں جو اسلامی نظام کی حامل جماعت پر عائد ہوتی ہیں)۔ لہٰذا، اگر اس کے انکار سے اسے کچھ نقصان ہوتا ہے تو اسے اس نقصان کو برداشت کرنا ہوگا۔: وَلَا یَزِیْدُ الْكٰفِرِیْنَ كُفْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اِلَّا مَقْتًا ۚ وَلَا یَزِیْدُ الْكٰفِرِیْنَ كُفْرُهُمْ اِلَّا خَسَارًا (35:39)۔۔۔ اس انکار سے انہوں نے خیر و برکت کے جو دروازے اپنے اوپر بند کئے ہیں، اس نقصان کے وہ خود ذمہ دار ہیں۔ وہ جس وقت بھی اپنی غلطی محسوس کریں، اس آئیڈیالوجی کو تسلیم کر لیں اور بلا روک ٹوک اس کے اندر داخل ہو جائیں۔

انہیں شریکِ راز نہیں کیا جا سکتا: لہٰذا اسلامی مملکت میں بسنے والوں میں سے جو لوگ اسلامی آئیڈیالوجی کو تسلیم نہ کریں، انہیں شریکِ حکومت نہیں کیا جا سکتا۔ اس باب میں قرآن کریم نے مختلف مقامات پر اس شرح و بسط سے وضاحت کر دی ہے کہ اسے سمجھنے میں کسی قسم کی دقّت پیش نہیں آ سکتی۔ شریکِ حکومت کرنا تو ایک طرف، وہ انہیں شریکِ راز بھی نہیں کر سکتا۔ سورہء آلِ عمران میں ہے: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا یَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ؕ۔۔۔ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا یَعْمَلُوْنَ مُحِیْطٌ (3:118-120)۔ اے ایمان والو! اپنوں کے سوا کسی کو اپنا راز دار نہ بناؤ۔ وہ تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔ جس بات سے تمہیں نقصان اور مصیبت پہنچے وہ اسے دل سے پسند کرتے ہیں۔ ان کے سینے کے اندر چھپے ہوئے جذباتِ بغض و عناد میں سے بعض اوقات کچھ (بے اختیار) ان کی زبان سے ظاہر ہو جاتے ہیں۔ لیکن جو ان کے سینے کے اندر چھپے رہتے ہیں وہ ان ظاہر ہو جانے والوں کے مقابلہ میں کہیں بڑھ کر ہیں۔ ہم نے تمام باتیں اچھی طرح واضح کر دی ہیں۔ اگر تم عقل و فکر سے کام لو گے (تو ان کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی)۔ ذرا سوچو تو سہی! کیا تم ان لوگوں سے محبت کرو گے جو تم سے کبھی محبت نہیں کرتے۔ حالانکہ تم (اپنی اور ان کی) تمام کتابوں پر ایمان رکھتے ہو۔ جب یہ لوگ تم سے

ملنے آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی (تمہارے آئین و دستور کو) صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ اور جب علیٰحدہ ہوتے ہیں تو غصے کے مارے اپنی انگلیاں کاٹتے ہیں۔ ان سے کہو کہ جاؤ! اپنے غصے (کی آگ میں) جل مرو۔ اللہ تمہارے سینوں کے اندر چھپے ہوئے جذبات تک سے واقف ہے۔ اگر تمہاری حالت بہتر ہو جائے تو یہ چیز انہیں سخت ناگوار گزرتی ہے اور اگر تمہیں کوئی تکلیف پہنچے تو یہ اس سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ یاد رکھو! اگر تم استقامت سے رہو گے اور مخالفین سے اپنی حفاظت کا سامان کرتے رہو گے تو ان کی کوئی سازش تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔ اللہ ان کے تمام اعمال کو محیط ہے۔ قرآن کریم میں اس مضمون کی بہت سی آیات ہیں۔ (مثلاً 3:27، 1 تا 60:4۔، 24۔9 23:وغیرہ)۔

یہ تنگ نظری نہیں:۔ حیرت ہے کہ بعض حلقوں میں اس نظریہ کو قابلِ اعتراض سمجھا جاتا ہے اور اسے ''تنگ نظری'' پر محمول کیا جاتا ہے۔ حالانکہ کوئی نظام جو آئیڈیالوجی کی بنیادوں پر استوار ہو، ان لوگوں کو کبھی شریکِ حکومت نہیں کر سکتا جو اس آئیڈیالوجی کے مخالف ہوں۔ اسلامی مملکت کا آئین درحقیقت اس کی آئیڈیالوجی ہوتا ہے۔ جو لوگ اس آئیڈیالوجی کو نہیں مانتے وہ اس مملکت کے آئین کو تسلیم نہیں کرتے۔ اب سوچئے کہ دنیا میں کوئی مملکت ایسی بھی ہو سکتی ہے جو ان لوگوں کو شریکِ حکومت کرے جو اس کے آئین کو تسلیم نہ کریں؟۔ کیا یہ عجیب بات نہ ہوگی کہ اسلامی مملکت کا مقصد اور نصب العین تو قوانینِ خداوندی کی عملاً ''تنفیذ'' ہو اور اس مقصد کے حصول میں ان لوگوں کو شریک کر لیا جائے جو خود اس مقصد ہی کے خلاف ہوں؟۔

غیر مسلموں سے حسنِ سلوک:۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ غیر مسلموں کو اسلامی مملکت میں کوئی حقوق حاصل نہیں ہوں گے۔ انہیں وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جنہیں قرآن کریم انسانوں کے لئے بنیادی حقوق قرار دیتا ہے۔ ان کی جان، مال، عزت، عبادت گاہیں سب محفوظ ہوں گی۔ انہیں شخصی مذہب کی آزادی ہوگی۔ ان سے حسنِ سلوک کیا جائے گا (8:60)، ان سے ہر حال میں عدل کیا جائے گا (5:8)۔'' طلوعِ اسلام ستمبر 1977ء کے صفحہ نمبر 22 پر اس کی مزید وضاحت کی کہ:۔'' ان تمام مراعات کے باوجود، اگر یہ غیر مسلم ترکِ وطن کرنا چاہیں تو انہیں ان کے مامن تک بحفاظت پہنچانے کا انتظام اسلامی مملکت کے ذمہ ہوگا۔ قرآن میں ہے کہ:۔'' (مفہوم) اور اگر مشرکین میں سے کوئی تمہارے پاس پناہ لے تو اسے پناہ دو، یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔ پھر (اگر وہ کہیں اور جانا چاہے تو) اسے اس کے امن کی جگہ تک پہنچا دو۔ یہ اس لئے کہ یہ لوگ یہ بات سمجھتے نہیں (کہ قرآن کریم کے ماتحت زندگی بسر کرنے سے کیا کیا فوائد حاصل ہوتے ہیں)۔۔ لیکن اگر وہ اسلامی مملکت میں رہتے ہوئے اس کے آئین سے سرکشی برتیں تو انہیں بغاوت کی سزا ملے گی (5:33-34)۔ یہ سزا مسلم اور غیر مسلم سب کے لئے یکساں ہے۔''

غیر مسلموں سے مشورہ:

البتہ غیر مسلموں سے مشورہ لینا جائز ہے۔ پرویز صاحب شاہکارِ رسالت میں ''نظامِ مشاورت'' کے ذیلی عنوان ''نوجوانوں اور عورتوں سے مشورہ'' کے تحت لکھتے ہیں کہ:۔''عام انتظامی امور اور بندوبست کے سلسلہ میں آپ (حضرت عمرؓ) ذمّی رعایا کو بھی شریک کر لیتے تھے کیونکہ ان معاملات کا تعلق بیشتر ان سے ہوتا تھا'' اور فٹ نوٹ میں وضاحت کرتے ہیں کہ:۔''یاد رکھیئے! غیر مسلموں سے مشورہ لیا جاسکتا ہے، انہیں شریکِ حکومت نہیں کیا جاسکتا۔ جس حکومت کا مقصد کتاب اللہ کے احکام کا عملی نفاذ ہو اس میں وہ لوگ کیسے شریک ہو سکتے ہیں جو اس کتاب پر ایمان ہی نہ رکھیں۔''

مخلوط انتخابات:

طلوعِ اسلام اپریل 1978ء۔ص 36:۔''انتخابات مخلوط ہونے چاہئیں یا جداگانہ ۔؟ یہ مسئلہ بڑا صاف اور سادہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا آپ اس سوال کا جواب اسلامی مملکت کے حوالے سے معلوم کرنا چاہتے ہیں یا سیکولر مملکت کے حوالے سے۔ اگر آپ کو سیکولر مملکت کے حوالہ سے اس کا جواب مطلوب ہے تو وہ بہت آسان ہے۔ سیکولر مملکت میں، حدودِ مملکت کے اندر بسنے والے تمام باشندے (مسلم اور غیر مسلم) ایک قوم ہوتے ہیں، اور ایک قوم میں مخلوط یا جداگانہ انتخاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ساری قوم کے لئے ایک ہی طریقِ انتخاب ہوتا ہے۔ اور اگر آپ اسلامی مملکت کے حوالے سے جواب معلوم کرنا چاہتے ہیں، تو بھی مسئلہ صاف اور سادہ ہے۔ اسلامی مملکت میں :۔(1)۔ مملکت صرف مسلموں کی ہوتی ہے۔ مسلم اور غیر مسلم کی مخلوط نہیں ہوتی۔ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ (24:55) کی قرآنی نص اس کی شاہد ہے۔(2)۔ اس مملکت میں معاملات صرف مسلموں کے باہمی مشورہ سے طے پاتے ہیں۔ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (42:38)۔ میں '' بَيْنَهُمْ ''(ان کے اپنے باہمی مشورہ سے) کی شرط بڑی اہم اور بنیادی ہے۔ علاوہ ازیں، قرآن بالفاظِ صریح کہتا ہے کہ غیر مسلموں کو اپنے رازوں میں شریک نہ کرو (3:117)۔(3)۔ اسلامی مملکت کے جملہ امور، حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے سرانجام پاتے ہیں، اس لئے غیر مسلم، جو حدود اللہ پر ایمان ہی نہیں رکھتے، اس کے شریکِ حکم نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا، اسلامی مملکت میں غیر مسلم، نہ ووٹ کے اہل ہو سکتے ہیں، نہ رکنیت کے۔ مملکت میں ان کی حیثیت ذمیوں کی ہوتی ہے۔ یعنی وہ جن کے جان، مال، عزت، آبرو، مذہب، معاہد کی حفاظت کی ذمہ داری، مملکت کے ذمے ہوتی ہے۔ ان کی حیثیت ایک (Community) کی ہوتی ہے، قوم کی نہیں۔ اسلامی مملکت میں قوم ایک ہی ہوتی ہے، یعنی مسلمانوں کی۔ غیر مسلم اس قوم کے افراد نہیں ہوتے۔ وہ صرف ایک سوسائٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

دوقوموں کی وضاحت:۔ اس مقام پر ایک اور نکتہ کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ غیر منقسم ہندوستان میں ہم نے ''دوقومی نظریہ'' کی اصطلاح اس لئے اختیار کی تھی کہ ہندوؤں کا دعویٰ تھا کہ ہندوستان میں صرف ایک قوم بستی ہے۔ اور ہمارا دعویٰ یہ تھا کہ وہاں ایک نہیں بستی، دوقومیں بستی ہیں۔ ایک قوم مسلمانوں پر مشتمل ہے اور دوسری قوم وہاں کے غیر مسلم باشندوں پر۔ پاکستان میں ہمیں ''دوقوموں'' کی اصطلاح استعمال نہیں کرنی چاہیئے۔ یہاں قوم صرف ایک ہے جو تمام کی تمام مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ غیر مسلم کوئی قوم نہیں۔

یہ پاکستان میں بسنے والی ایک سوسائٹی ہے جسے فقہی اصطلاح میں ''اہل الذمہ یا ذمی'' کہا جاتا ہے۔ یہاں اب مسلم قوم اور ذمی ہی بستے ہیں۔ پاکستانی قوم سے مراد بھی صرف مسلم قوم ہوگی۔ آئینِ پاکستان میں اس کی وضاحت کرنی چاہیئے۔ ان حضرات کو کہتے سنا گیا ہے کہ اس زمانے میں کسی مملکت میں اس قسم کی پوزیشن تو بڑی انوکھی سی بات ہے۔ ان کی خدمت میں گزارش ہے کہ اِس دور میں سب سے انوکھی بات تو مذہب (دین) کی بنیادوں پر مملکت کا قیام ہے۔ جب آپ نے اس ''انوکھے مطالبہ'' پر مملکت حاصل کی ہے تو پھر اس کے تضمنات کے انوکھے پن سے کیوں گھبراتے ہیں؟۔۔۔ اصل یہ ہے کہ ہم لوگوں نے اسلام کے نام پر مملکت تو حاصل کر لی ہے لیکن مملکت کا تصور ہمارے ذہنوں میں وہی مغربی سیکولر اسٹیٹ کا ہے۔ لیکن قرآن کریم کی رو سے اس قسم کی ثنویت (Dualism) تو شرک ہے۔ اور خدا کا ارشاد ہے کہ قوموں کے دیگر جرائم تو قابلِ عفو ہو سکتے ہیں۔ شرک قابلِ عفو نہیں ہوتا (4:48)۔ اور اس جرم کی سزا بڑی سخت ہے۔ یعنی:۔ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ۚ وَیَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یُرَدُّوْنَ اِلٰٓی اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ (2:85)۔ اس دنیا میں ذلت وخواری اور اُخروی زندگی میں شدید ترین عذاب۔''

مذہبی آزادی:

طلوعِ اسلام جون 1977ء میں صفحہ نمبر 21 پر غیر مسلموں کی مذہبی آزادی کے بارے میں جناب پرویز صاحب رقمطراز ہیں۔ ''اسلامی نظام کے تابع، ہر انسان کو مذہبی آزادی کا حق حاصل ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک ایمان نام ہے، کسی صداقت کو، عقل وفکر کی رو سے علیٰ وجہ البصیرت ماننے کا۔ لہٰذا، اس میں جور واکراہ کا کوئی دخل نہیں ہوسکتا۔: وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّکُمْ ۟ فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ ۙ (18:29)۔ ''ان سے کہہ دو کہ حق تمہارے رب کی طرف سے (اس قرآن میں) آچکا ہے۔ تم اس پر غور وفکر کرو، اور اس کے بعد، جس کا جی چاہے اسے تسلیم کر لے، جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔'' اس نے واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ خارجی کائنات اور انسان میں بنیادی فرق ہی یہ ہے کہ کائنات کی ہر شے اُس راستے پر چلنے کے لئے مجبور ہے جو اُس کے لئے تجویز کیا گیا ہے۔

انسان، صاحبِ اختیار وارادہ:

لیکن انسان کو صاحبِ اختیار وارادہ پیدا کیا گیا ہے۔ اُسے راستہ دکھا دیا گیا ہے اور اس کے بعد، یہ اُس کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ اس راستے کو اختیار کرے، یا اس سے انحراف برتے۔ وہ اگر اسے اختیار کرے گا تو اس کی زندگی خوشگواریوں میں بسر ہوگی۔ اس سے سرتابی برتے گا، تو نقصان اٹھائے گا۔ اگر اسے مجبوراً صحیح راستے پر چلانا مقصود ہوتا تو اسے بھی دیگر اشیائے کائنات کی طرح مجبور پیدا کر دیا جاتا۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ اُسے صاحبِ اختیار وارادہ پیدا کیا گیا ہے۔ اب یہ بات منشائے خداوندی کے خلاف ہوگی کہ اُسے ایک خاص راستہ اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے۔ قرآن کریم میں نبی اکرم ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا: وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا۔ اگر تمہارے خدا کے پروگرام میں یہ ہوتا کہ انسان کو ایمان کے راستے پر مجبوراً چلایا جائے تو اس کے لئے ایسا کرنا کیا مشکل تھا؟۔ وہ انسانوں کو پیدا ہی ایسے کرتا کہ وہ سب کے سب، آنکھ بند کئے، بھیڑ بکریوں کی طرح، اس راستے پر چلے جاتے۔ لیکن اس نے انسانوں کو ایسا پیدا نہیں کیا۔ اسے اس باب میں اختیار دیا گیا ہے۔ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (10:99)۔ ''تو کیا تو انہیں مجبور کرے گا کہ وہ بالضرور ایمان لے آئیں'' یہ تو مشیتِ خداوندی کے خلاف ہوگا۔ اس لئے تیرا کام یہ ہے کہ تو اس پیغام کو ان لوگوں تک پہنچائے جا۔ اس سے زیادہ کا تو مکلف نہیں۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ (2 : 256)۔ ''غلط اور صحیح راستہ (اس قرآن کے ذریعے) متمیز ہو کر سامنے آچکا ہے۔ اس کے بعد دین کے معاملہ میں کسی پر کوئی جبر نہیں ہوگا۔'' حقیقت یہ ہے کہ اسلام ایک مذہب نہیں (مذہب کا لفظ سارے قرآن میں کہیں نہیں آیا) اس لئے وہ مذاہبِ عالم میں سے کسی کو اپنا حریف قرار نہیں دیتا۔ وہ ایک دین، یعنی ضابطہء زندگی یا نظامِ حیات ہے۔۔ وہ اس کی اجازت تو نہیں دے سکتا کہ اس کی حدودِ مملکت میں رہنے والے کوئی دوسرا نظامِ مملکت قائم کریں۔ یہ تو ''ریاست درونِ ریاست'' (State within a state) قائم کرنے کے مرادف ہوگا۔ جس کی کہیں بھی اجازت نہیں مل سکتی۔ لیکن وہ اس سے کچھ تعرض نہیں کرتا کہ اس کے حدودِ مملکت میں رہنے والے اپنے لئے مذہب کون سا پسند کرتے ہیں۔۔۔ اتنا ہی نہیں کہ وہ ہر ایک کو مذہبی آزادی عطا کرتا ہے، وہ جہاں اپنے نظام کے مراکز، یعنی مساجد کی حفاظت کرتا ہے، وہاں، تمام اہلِ مذاہب کی پرستش گاہوں کی بھی حفاظت اپنے ذمے لیتا ہے۔ وہ اسلامی مملکت کے وجود کی ایک وجہء جواز یہ بھی بتاتا ہے کہ:۔ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۭ (22:40)۔ اگر اللہ انسانوں کے ذریعے، سرکش قوتوں کی روک تھام

کا انتظام نہ کرتا تو یقیناً راہبوں کی خانقاہیں، عیسائیوں کے گرجے، دیگر اقوام کی پرستش گاہیں اور مسجدیں جن میں بکثرت خدا کا نام لیا جاتا ہے، ڈھا دی جاتیں۔ (لہٰذا، ان تمام معبدوں کی حفاظت، قرآنی مملکت کی ذمہ داری ہے، جس کا ہر غیر مسلم، بطور اپنے حق، کے مطالبہ کر سکتا ہے)۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس نے جماعتِ مومنین سے تاکیداً کہا ہے کہ: وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ تم غیر مسلموں کے معبودوں کو گالی مت دو۔ تم ایسا کرو گے تو وہ، اس کے مقابلہ میں بربنائے جہالت، اللہ کو گالی دے دیں گے۔ سو جس طرح تمہیں یہ برا لگے گا، اسی طرح، ان کے معبودوں کو تمہارا گالی دینا بھی برا لگتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ: كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ۠ (6:108)۔ ہر ایک کو اپنا اپنا مسلک اور اپنا اپنا معبود پسند ہوتا ہے۔ تم ان تک حق کی بات پہنچاؤ۔ جب یہ، بربنائے علم و بصیرت، غلط اور صحیح میں تمیز کرنے کے قابل ہو جائیں گے، تو خود بخود، ان معبودانِ باطل کو چھوڑ کر، صحیح نظامِ زندگی اختیار کر لیں گے۔ لہٰذا، اسلامی نظام، نوعِ انسان کو، مذہبی آزادی کا حق ہی نہیں دیتا بلکہ اس کی بھی ضمانت دیتا ہے کہ کوئی ان کے معبودوں کے خلاف زبان درازی یا ان کی شان میں گستاخی نہ کرے۔''

دوسرے مذاہب کی آزادی کی خاطر جنگ:

طلوعِ اسلام ستمبر 1971ء، ص: 27: ''جس قوم کا فریضہ یہ ہو کہ وہ جان دے کر بھی دوسرے اہلِ مذاہب کی مذہبی آزادی کو برقرار رکھے، کیا اس کے لئے کسی صورت میں بھی جائز ہوگا کہ وہ کسی شخص کو بزورِ شمشیر مسلمان بنائے، یا جو (بدقسمت) مسلمان، کوئی دوسرا مذہب اختیار کرنا چاہے، اسے اس سے بزورِ شمشیر روکا جائے۔ یہ تصور قطعاً غلط اور اسلام کے اساسی اصولوں کے خلاف ہے۔: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (256 : 2) اس کا بنیادی اصول ہے اور، فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۙ (18:29)۔ ''جس کا جی چاہے ایمان لے آئے، جس کا جی چاہے کفر اختیار کر لے''۔ اس کا عالمگیر منشور۔ جب اس نے کہا تھا کہ:۔ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ (2:193) تو اس سے بھی یہی مراد تھی۔ یعنی اگر کوئی قوم کسی دوسرے کی مذہبی آزادی سلب کرنا چاہے، تو تم اس مستبد قوم کے خلاف جنگ کرو، اور اس جنگ کو اس وقت تک جاری رکھو جب تک ایسے حالات پیدا نہ ہو جائیں کہ مذہب صرف خدا کی خاطر اختیار کیا جائے۔ اس میں کسی قسم کے خارجی اثر یا دباؤ کا دخل نہ رہے۔ وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ، عالمگیر مذہبی آزادی کا ایسا ابدی منشور ہے جس کی مثال کہیں اور نہیں مل سکتی۔ اس شکل میں جنگ بھی مدافعانہ رہتی ہے۔۔ لیکن اس میں صرف اپنی اور اپنے دین کی مدافعت نہیں بلکہ دنیا بھر کے اہلِ مذاہب کی مذہبی آزادی کی مدافعت مقصود ہے۔ یہ جہاد فی سبیل اللہ کی دوسری شکل ہے۔''

(جاری ہے)

ڈاکٹر عائشہ صدیقہ

ایک نابغۂ روزگار کی رحلت

برق رفتاری سے گزرتے ہوئے دورِ جدید (ڈیجیٹل ایج) میں ایامِ رفتہ کا تصور کرنا بھی مشکل دکھائی دیتا ہے کہ جس میں کسی بڑی شخصیت کے جہانِ فانی سے رحلت کر جانے کے صدمے کو محسوس کیا جاتا تھا۔ میں اُن وقتوں کی بات کر رہی ہوں جب کسی نابغۂ روزگار کی رحلت سے آسمان ٹوٹ پڑتا تھا، دنیا تاریک دکھائی دیتی اور وقت کی نبض تھمتی محسوس ہوتی۔ مجھے یقین ہے کہ چند عشرے پہلے مس شمیم انور کی رحلت کی خبر سن کر چرخِ نیلی فام تاریک اور سورج سرد ہو جاتا۔ مس شمیم انور، جو تاریخ کی بے مثال استاد تھیں، سترہ جنوری کو لاہور میں خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔ ہوسکتا ہے کہ بہت سے قارئین کو اُن کی علمی عظمت کا احساس نہ ہو، اور ممکن ہے کچھ اُن سے واقف بھی نہ ہوں۔ چونکہ تدریس کا پیشہ بھی آج کل سماجی طور پر قابل قبول سمجھا جاتا ہے، چنانچہ بہت سے بھاری مشاہرہ وصول کرنے والے عمدہ اساتذہ نجی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں فرائض سرانجام دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ تاہم میں 1970ء اور 1980ء اور 1990ء کی دہائیوں کی بات کر رہی ہوں جب نجی شعبے میں پڑھانے والوں کو کچھ نہیں ملتا تھا۔ تاہم مس انور کے لیے یہ کوئی چیلنج نہ تھا۔ وہ اکثر کنیئرڈ کالج برائے خواتین کے وسیع و عریض لان میں بیٹھی دکھائی دیتیں اور کالج کے تدریسی اوقات کے بعد گھنٹوں اپنے محبوب موضوع، تاریخ پر بات کرتی رہتیں۔ یہ پرائیویٹ ٹیوشن کی کلاس نہیں تھی بلکہ علم کی لگن اور سوالات کی تشنگی بجھانے کے لیے طالبات اُن کے گرد اکٹھی ہو جاتیں۔ اس دوران بہت سے دلچسپ سوالات پوچھے جاتے۔

مس شمیم انور نے 1960ء کی دہائی میں میک گل سے تاریخ میں گرایجوایشن کی تھی۔ اس موضوع اور اپنی طالبات سے محبت کرنے والی بہت کم ٹیچرز دیکھنے میں آئی ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ وہ حیران کن طریقے سے برصغیر پاک و ہند کی تاریخ پڑھاتی تھیں۔ وہ ہمارے سامنے کی خطے کی تاریخ کے خدوخال بیان کرتیں، اس کے واقعات کا آپس میں اور عالمی واقعات اور ہونے والی پیش رفت سے تعلق جوڑتیں۔ وہ اس دوران سازش کی تھیوریوں پر بات نہیں کرتی تھیں لیکن چاہتی تھیں کہ طالبات دنیا اور دیگر خطوں میں اُس وقت ابھرنے والے منظرنامے کو ذہن میں رکھیں۔ اس سے پالیسیوں اور ان کے نتائج و عواقب کی تفہیم آسان ہو جاتی۔ وہ سوالات کے جواب کی تلاش میں ہمیں تحقیق کی ہدایت کرتیں۔ مجھے یاد ہے کہ میں ایک مرتبہ انتہائی پریشان ہوئی جب انیسویں صدی کے انڈیا کے بارے میں بحث کرتے ہوئے انہوں نے مجھے لاتعداد کتابیں پڑھنے کی

ہدایت کردی کہ میں ان کا مطالعہ کر کے جواب تیار کروں۔ جب میں نے جواب تیار کرلیا تو مجھے طمانیت محسوس ہوئی اور میں سمجھ گئی کہ اُنہوں نے اس طریقے سے مجھے اُس سے کہیں زیادہ سمجھا دیا تھا جو میں ان کتابوں کے مطالعے کے بغیر سیکھ سکتی تھی۔ اُن کا مقصد طالبات میں سوالوں کے جواب تلاش کرنے کا جذبہ پیدا کرنا ہوتا تھا۔

وہ یقیناً جدید نظریات رکھنے والی خاتون تھیں۔ طالبات کی حوصلہ افزائی کرتیں تا کہ وہ اپنی آزادی کو محسوس کریں اور سمجھا تیں کہ آزادی صرف جسمانی نہیں، فکری ہوتی ہے۔ مس انور نے جدت پسندی کو اپنایا تھا، خاص طور پر سیاسی طور پر، اور اسی پیرائے میں سرسید احمد خان، محمد علی جناح اور سر محمد اقبال کی وضاحت کرتیں۔ یہ تینوں عظیم شخصیات اُنہیں بہت پسند تھیں۔ وہ میری اُس وقت ٹیچر تھیں جب 1980ء کی دہائی میں نظریۂ پاکستان تبدیلی کے عمل سے گزرتا ہوا ایک مختلف سمت اختیار کررہا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ چند تاریخ کے دیگر اساتذہ قومی سلامتی کو جواز بنا کر مس انور کے بارے میں چوکنے رہتے۔ ایسا لگتا جیسے وہ نظریۂ پاکستان کے ساتھ والہانہ لگاؤ اور جذباتی تعلق رکھتی ہیں۔ بعض اوقات ہم نجی ملاقاتوں میں از راہِ مذاق ایک دوسرے سے کہتے کہ اگر آج مسٹر جناح حیات ہوتے تو مس انور اُن پر اس طرح فریفتہ ہوتیں جیسے نوجوان لڑکیاں دھماکہ خیز فلمی ہیروز پر۔ تاہم ایک استاد کی اصل آزمائش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے ذاتی، نظریات اور فکری تعصّبات سے بلند ہو کر مختلف اور مخالف نظریات کو بھی سامنے لائے۔ میں ایسے بہت سے نامی گرامی ٹیچرز کو جانتی ہوں جو مسٹر جناح کے تصورات پر ایک سوال تک اٹھانے پر طلبہ پر برس پڑیں گے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ 1971ء کے سانحہ پر اسائنمنٹ تیار کرتے ہوئے میں نے سوال اٹھایا کہ مسٹر جناح نسلی اور لسانی شناختوں اور ان کے بنگالیوں اور ملک کی دیگر قومیتوں کی زندگیوں میں اثرات پر کیا رائے رکھتے تھے؟ مس انور نے میری تحریر پر ردِعمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا، میں نے اپنی سوچ کے مطابق دلیل دیتے ہوئے اُن کی پسند اور ناپسند کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ایک اچھی استاد ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک اچھی سٹوڈنٹ بننا بھی پسند کرتیں اور اپنی شاگردوں کے افکار و خیالات کو بڑی توجہ سے سنتیں۔ جب وہ اپنے تدریسی فرائض سے سبکدوش ہوگئیں تو میرا اُن سے رابطہ رہا اور کبھی کبھار اُن سے ملاقات اور سیاسی موضوعات پر گپ شپ ہوجاتی۔ وہ طالبات پر اپنی رائے مسلط کرنے کی بجائے کمال تحمل کے ساتھ اُن کی باتیں سنتیں اور سوالات کے جواب دیتیں۔

جب میں نے اُن کی رحلت کی خبر سنی تو مجھے شدید افسوس ہوا کہ ایک اور قیمتی جان اس وطن سے رخصت ہوئی اور دوسرے یہ کہ میں نے اور بہت سے دیگر افراد نے اُنہیں مایوس کیا تھا۔ زندگی مشکل ہوتی ہے، اور مس انور کی زندگی کا آخری عشرہ بطورِ خاص بہت کٹھن تھا۔ اُنہیں آخری عمر میں ایک ایسی خاتون کے گھر میں سر چھپانے کے لیے پناہ تلاش کرنی پڑی جو کبھی اُن کی ملازمہ ہوتی تھیں۔ بعض اوقات کینیڈ کی کچھ سابق طالبات مل کر کچھ رقم جمع کر کے اُن کی مالی مدد کردیتیں، لیکن

کسی نے اُن کے ساتھ ذہنی طور پر رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ شاید ہمارا غرور یا کھوکھلا پن ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ کسی انسان کی ضرورت محض چند ہزار روپے ہی ہوتے ہیں۔ ہم اس عظیم استاد پر توجہ کیوں نہ دے سکے جس نے اپنی زندگی کے بہترین لمحات میں ہمیں سوچنا سکھایا تھا۔

کیا مجھ سے اُس شخصیت کو نظر انداز کرنے کی غلطی نہیں ہوئی جس نے میرے تخیل کو جلا بخشی؟ شاید کسی اور شخصیت کا مجھ پر اتنا گہرا اثر نہیں جتنا مس انور کا۔ اُنہوں نے بہت سی خواتین کی فکری آبیاری کی جو بعد میں اپنے اپنے شعبوں میں بہت کامیاب ثابت ہوئیں۔ ہم سب کی سوچ سمجھ دراصل مس انور کا فکری پھیلاؤ ہے۔ ایسا استاد فطرت کسی وطن کو ہر روز نہیں دیتی، ایسے لوگ زمانوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔

اُن کی رحلت کے ساتھ میں نے ایک استاد، ایک مہربان اور ایک فکر انگیز شخصیت کو کھو دیا۔ ڈبلیو ایچ ایڈن کے چند ایک اشعار اُن کی خدمت میں۔

Stop all the clocks, cut off the telephone,
Prevent the dog from barking with a juicy bone,
Silence the pianos and with muffled drum
Bring out the coffin, let the mourners come.
Let acroplanes circle moaning overhead
Scribbling in the sky the message She is Dead.

(بشکریہ روزنامہ دنیا، 21 جنوری 2016ء)

رسالہ نہ ملنے کی صورت میں مندرجہ ذیل نمبرز پر رابطہ کریں شکریہ
Cell: 0321-4460787 Phone: 042-35714546

ضرورتِ رشتہ

ہماری بیٹی تعلیم نفسیات میں ماسٹر ڈگری، عمر 24 سال، قد تقریباً 5 فٹ 3 انچ، قرآنی فیملی اور فکر سے تعلق رکھنے والے حضرات رابطہ کریں۔

رابطہ نمبر والد مرزا مختار احمد
0323-1426388

سانحہ ارتحال

محترمہ شمیم انور صاحبہ 17 جنوری 2016ء کی شب کو اِس دارِ فانی سے انتقال فرما گئیں۔ مرحومہ ایک معروف ماہرہ تعلیم، دانشور اور تاریخ دان تھیں۔ انہوں نے میک گل یونیورسٹی سے تاریخ میں ڈگری حاصل کی تھی اور انگریزی میں ایک مقالہ بعنوان ''سرسید بطور ماہرِ تعلیم'' قلم بند کیا تھا جو کہ ماہنامہ طلوعِ اسلام میں قسط وار چھپتا رہا اور بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوا۔ میک گل سے ڈگری حاصل کرنے کے بعد انہوں نے تمام عمر کنیئرڈ کالج لاہور میں پڑھایا۔ طلوعِ اسلام کے حلقے میں بھی وہ جانی پہچانی تھیں۔ ماہنامہ طلوعِ اسلام میں ہمیشہ گاہے بہ گاہے لکھتی رہیں۔ درسِ قرآن میں ہمیشہ شرکت کی اور ادارہ کے کنونشنز میں خاص طور پر شمولیت کرتیں ان کے شاگردوں میں سے بہت سُوں نے پاکستان کے مختلف شعبوں میں نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ طلوعِ اسلام کے زیرِ نظر شمارہ میں ملک کی معروف دفاعی امور کی تجزیہ کار محترمہ عائشہ صدیقہ کا کالم شامل ہے۔ جس سے مرحومہ شمیم انور صاحبہ کا کام اور مقام مزید روشن ہو کر سامنے آتا ہے۔

ادارہ مرحومہ کے اعزہ واقرباء، تمام عمران کی کیئر (Care) کرنے والی فیملی ان کے تمام دوستوں اور ملک بھر میں پھیلے شاگردوں کے دُکھ میں برابر کا شریک ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو کروٹ کروٹ جنت عطا کرے۔

محمد اکرم راٹھور
چیئرمین ادارہ طلوعِ اسلام لاہور

سانحہ ارتحال

پرویز صاحب کی متعدد کتب کے انگریزی ترجمہ نگار اور بزم طلوعِ اسلام لندن (یوکے) کے سینئر رُکن محترم خالد سید صاحب کی رفیقۂ حیات گذشتہ دنوں انتقال فرما گئیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کے درجات بلند کرے اور کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ ادارہ خالد سید صاحب اور ان کے بچوں اور تمام اعزہ واقربا کے دُکھ میں برابر کا شریک ہے۔

محمد اکرم راٹھور
چیئرمین ادارہ طلوعِ اسلام لاہور

عمر احمد عثمانی مرحوم

قرآنی معاشرہ

(باہمی تعلقات کے متعلق قرآن کی تعلیم)

اس مضمون کی گذشتہ اقساط میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ اولاد کو اپنے والدین کے ساتھ اور والدین کو اپنی اولاد کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہئے اور اس سلسلہ میں اولاد اور والدین کے کیا فرائض وواجبات ہیں۔ مضمون کی حالیہ قسط میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ بہن بھائیوں کے باہمی تعلقات کس قسم کے ہونے چاہئیں اور ان کے فرائض وواجبات کیا ہیں؟

بھائی بہنیں:

قرآنی معاشرہ میں بھائیوں اور بہنوں کے تعلقات کس قسم کے ہونے چاہئیں۔ اس کو سمجھنے کے لیے ہمیں پہلے ان الفاظ کے بنیادی معنوں پر غور کر لینا چاہئے۔ جو قرآنِ کریم نے اس تعلق کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کئے ہیں۔ بنیادی معنی سمجھ میں آجانے کے بعد اس تعلق کی واضح تصویر سامنے آجاتی ہے جو قرآن اس سلسلہ میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔

عربی زبان میں بھائی کو ''اَخٌ'' اور بہن کو ''اُخْتٌ'' کہتے ہیں۔ یہ دونوں لفظ اٰخِیَّۃٌ اور اَخِیَّۃٌ یا اٰخِیَۃٌ اور اَخِیَۃٌ سے نکلے ہیں۔ عربی زبام میں اٰخِیَّۃٌ اور اَخِیَّۃٌ اس لکڑی کو کہتے ہیں جس کے دونوں کنارے دیوار کے اندر چُنے ہوئے ہوں اور درمیانی حصہ جانوروں کو باندھنے کے لیے کھلا ہوا ہو۔ یا اس رسی کو کہتے ہیں جس کے دونوں کنارے زمین میں مٹی کے نیچے دبے ہوئے ہوں اور اس کا درمیانی حصہ ایک حلقہ کی صورت میں زمین پر ابھرا ہوا ہو۔ تاکہ اس کے ساتھ گھوڑوں اور دیگر جانوروں کو باندھا جا سکے اَخٌ اور اُخْتٌ اسی اٰخِیَّۃٌ اور اَخِیَّۃٌ سے نکلے ہیں۔ (محیط الحیط، ص:12، ج:1) یہ ہے اَخِیَّتُ (بھائی چارگی) کی بنیادی تصویر کہ لکڑی یا رسی کے دونوں کنارے اپنی اپنی انفرادیت (Individuality) رکھتے ہیں مگر وہ دیوار کے اندر چُنے ہوئے یا زمین کے نیچے دبے ہوئے ہوتے ہیں۔ مشاہدہ میں جو چیز آتی ہے۔ وہ ان کا درمیانی حصہ ہوتا ہے جو خود ایک وحدت ہوتا ہے۔ یعنی دو ہوتے ہوئے بھی ایک، جبکہ دوئی غیر مشہود (Invisible) اور وحدت مشہود (Visible) ہوتی ہے۔ بھائی بھائی، اپنی اپنی شخصیت اور انفرادیت تو رکھتے ہیں۔ مگر ان کی یہ انفرادیت اور شخصیت غیر مشہود سی ہونی چاہیئے۔ ورنہ وہ دونوں اس درجہ متحد العمل اور متحد الخیال ہوں کہ دونوں ایک ہی وحدت معلوم ہوتے ہوں۔ ابن عرفہ نے کہا ہے کہ اُخُوَّت کے معنی

بھائی بھائی ہونے کے علاوہ ہم شکلی اور عملی ہم آہنگی کے بھی ہوتے ہیں۔ (تاج العروس، ص:11، ج:10) قرآنِ کریم نے اِخْوَانٌ (اَخٌ کی جمع ہے) کا لفظ اَعْدَاءٌ کے مقابلہ میں استعمال کرکے اَخٌ کے معنی کو اور بھی واضح کر دیا ہے۔ چنانچہ سورۂ آل عمران میں ہے۔

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا (3:103)

اَعْدَآءً انہیں کہتے ہیں جن کے درمیان میں پچر (Wedge) لگ رہی ہو لہٰذا اَعْدَآءً کے مقابلہ میں اِخْوَانٌ وہ ہوں گے۔ جن کے درمیان میں کوئی چیز حائل نہ ہو۔ جن کے دل آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح مل چکے ہیں جیسے بادل کا ایک ٹکڑا دوسرے ٹکڑے سے گھل مل جاتا ہے (فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ) بادل کے دو ٹکڑے اپنی اپنی انفرادیت رکھتے تھے مگر وہ اپنی انفرادیت کو کھو کر ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح گھل مل جاتے ہیں کہ خود ایک وحدت بن جاتے ہیں۔ اب تو جو چیز نظر آتی ہے وہ ایک وحدت ہی نظر آتی ہے اور دونوں ٹکڑوں کی انفرادیت بالکل گم ہو جاتی ہے۔ ان کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں رہتی بعض علمائے نحو کا خیال ہے کہ بھائی کو اَخٌ اس لیے کہتے ہیں کہ اس کا ارادہ اور آہنگ بعینہٖ وہی کچھ ہوتا ہے جو دوسرے بھائی کا ہوتا ہے۔ چنانچہ ان کا خیال ہے کہ یہ وخیٰ سے نکلا ہے۔ جس کے معنی ارادہ کرنے کے ہوتے ہیں اَخٌ میں دخیٰ کا واؤ ہمزہ کے ساتھ بدل لیا گیا ہے اس سے معلوم ہو گیا کہ بھائی کو اَخٌ اس لیے بھی کہتے ہیں کہ دونوں ہم مقصد ہوتے ہیں۔ یعنی ایک کا ارادہ بعینہٖ وہی کچھ ہوتا ہے جو دوسرے کا ہوتا ہے۔ ایک کی مرضی دوسرے کی مرضی میں گم ہو جاتی ہے۔

قرآنِ کریم تمام مومنین کو اِخْوَةٌ کہتا ہے (اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ) (49:10) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مومنین کا معاشرہ کن بنیادوں پر قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس موضوع پر ہم آئندہ روشنی ڈالیں گے۔ مگر سرِ دست یہاں اتنا سمجھ لیجئے کہ بھائیوں اور بہنوں کے تعلقات آپس میں کس قسم کے ہونے چاہئیں۔

تصریحات بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ عربی لغت کے اعتبار سے بھائی بہن (اَخٌ اور اُخْت) ان کو کہتے ہیں جو اگرچہ اپنے اپنے طور پر الگ الگ اپنی اپنی انفرادیت رکھتے ہیں مگر ان کی یہ انفرادیت غیر مشہودی ہوتی ہے۔ مشہود طور پر جب وہ سامنے آتے ہیں تو شکل وصورت، دل ودماغ عمل اور مقصد میں وہ اس طرح پر گھلے ملے ہوتے ہیں کہ ایک ہی وحدت نظر آتے ہیں جیسے بادل کے دو ٹکڑے آپس میں گھل مل کر ایک ذات ہو جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ذرا اس نکتہ پر بھی غور کیجئے کہ اس اَخِیَّتْ کا وجود اسی وقت تک برقرار رہے۔ جب تک لکڑی یا رسی کے دونوں کنارے اپنی پوری توانائی اس حلقہ کو باقی رکھنے پر صرف کرتے رہیں جونہی ان میں سے ایک پر خودنمائی کا شوق سوار ہوا اور وہ دیوار یا زمین سے باہر نکل آیا تو یہ حلقہ ختم ہو گیا۔ بعینہٖ یہی حال اُخُوَّتْ کا بھی ہے۔ بھائی بھائی اسی وقت تک بھائی بھائی ہیں جب تک وہ مشترکہ مقصد کے لیے اپنی پوری

توانائیاں صرف کرتے رہیں۔ جونہی ان میں سے کسی ایک کے دل میں خودغرضی اور خودنمائی کا جذبہ ابھرا ان کی اخوت ختم ہوگئی۔ جیسے رسّی اور لکڑی کے دونوں کنارے اپنے وسط میں آکر مل جاتے اور ایک ہوجاتے ہیں۔ ایسے ہی بھائی بھائی کا مرکز خیال وعمل بھی بالکل ایک ہی ہوتا ہے۔ خوب سمجھ لیجئے کہ بھائی بھائی میں اگر یہ مرکزی وحدت نہیں ہے تو اخوت بھی نہیں ہے۔ آپ نے دیکھ لیا کہ عربی زبان کے لحاظ سے بھائی کسے کہتے ہیں اور اخوت کے لیے کیا کیا چیزیں ضروری ہیں۔ یعنی دو بچوں کا ایک ماں باپ کے گھر پیدا ہوجانا ہی انہیں بھائی بھائی یا بھائی بہن نہیں بنا دیتا۔ اخیت کا یہ تعلق محض حیاتیاتی Biological ہوتا ہے۔ جس پر کسی کو اختیار نہیں ہوتا۔ اخوت کا صحیح تعلق اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب ایک ماں باپ کے گھر پیدا شدہ بچے فکر اور مقصد میں ہم آہنگ اور ایک دوسرے کے بہی خواہ اور غمگسار رہوں۔ یعنی بھائی بھی وہی بھائی ہے جو دوست ہو۔

قرآن جو معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے اس معاشرہ میں بہن بھائیوں کا کیا مقام ہوگا اسے تو آگے چل کر دیکھئے گا فی الحال اتنا دیکھ لیجئے کہ زمانہ جاہلیت میں عربوں کے ہاں بہن بھائیوں کا جو تصور ہوتا تھا اور جس تصور کے ماتحت وہ بھائی کو اَخٌ اور بہن کو اُخْتٌ کہتے تھے آیا ہم مسلمانوں کے موجودہ معاشرہ میں اس تصور کا نام ونشان بھی ملتا ہے؟ قرآن تو ہر مومن کو دوسرے مومن کا بھائی (اَخٌ) قرار دیتا ہے۔ اسے بھی چھوڑیئے، یہ دیکھئے کہ ماں جائے سگے بھائی بہنوں میں بھی ہمارے ہاں آج وہ صورت ہے یا نہیں جو عربی زبان کے لحاظ سے اخوت کے لیے ضروری تھی۔ یقیناً نہیں ہے۔

بہن بھائیوں کے ساتھ حسنِ سلوک:

قرآنی نقطۂ نظر سے ایک بھائی کو دوسرے بھائی بہن کے ساتھ ہمیشہ حسنِ سلوک کے ساتھ پیش آنا چاہئے، مصائب ومشکلات سے ان کی حفاظت کرنا ان کی بالیدگی اور نشوونما کے لیے ضروری سامان مہیا کرنا۔ نرمی اور شفقت کے ساتھ ان سے پیش آنا۔ ان کی غمخواری کرنا۔ تمام چیزیں اس میں داخل ہیں۔ چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس سرزمین مصر میں ان کے بھائی پہنچے ہیں اور حضرت یوسف علیہ السلام کی ملاقات اپنے سگے چھوٹے بھائی سے ہوئی ہے تو اس کو قرآنِ کریم نے اس طرح بیان کیا ہے کہ:

وَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰی یُوْسُفَ اٰوٰٓی اِلَیْهِ اَخَاهُ قَالَ اِنِّیْٓ اَنَا اَخُوْكَ فَلَا تَبْتَىِٕسْ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (12:69)

اور جب برادرانِ یوسف، یوسف کے پاس پہنچے تو یوسف نے اپنے (چھوٹے سگے) بھائی کو اپنے پاس پناہ دی اور کہا۔ میں تیرا بھائی ہوں۔ جو کچھ یہ لوگ کرتے رہے ہیں۔ اس پر اب غمگین نہ رہو۔

آویٰ کے لفظ میں پناہ دینا، حفاظت کرنا، سامان نشوونما مہیا کرنا، نرمی اور شفقت کے ساتھ پیش آنا۔ ساری ہی چیزیں آجاتی ہیں۔

بھائی قوتِ بازو ہوتے ہیں:

جیسا کہ لفظ اَخٌ کی تشریح کرتے ہوئے پہلے بتایا جا چکا ہے کہ بھائی کو اَخٌ کہتے ہی اس لیے ہیں کہ وہ مقصد میں ایک دوسرے کے مددگار اور شریک ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کے لیے باعث تقویت ہوتے ہیں۔ عمل اور خیال میں ہم آہنگ اور ایک دوسرے کے ناصر و معین ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب موسیٰ علیہ السلام کو منصبِ رسالت سے نوازا گیا اور انہوں نے پیش نظر مہم کی اہمیت اور خطرناکی کا اندازہ لگایا تو بارالٰہی میں عرض کی۔

وَاَخِیْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِیَ رِدْاً یُّصَدِّقُنِیْٓ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یُّكَذِّبُوْنِ (28:34)

میرا بھائی ہارون جس کی زبان مجھ سے زیادہ فصیح ہے۔ اسے میرا پشت پناہ بنا کر میرے ساتھ بھیج دیجئے کہ وہ میری تصدیق کرے۔ کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ مصر والے مجھے جھٹلا دیں گے۔

یہاں موسیٰ علیہ السلام نے ہارون علیہ السلام کو اپنا پشت پناہ قرار دیا ہے۔ جس کے جواب میں ارشادِ باری ہوتا ہے۔

قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِیْكَ وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا یَصِلُوْنَ اِلَیْكُمَا (28:35)

حق تعالیٰ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ ہم تمہارے بازو کو تمہارے بھائی سے قوی کئے دیتے ہیں اور تم دونوں کے لیے ایسی برہان کا انتظام کر دیتے ہیں کہ وہ لوگ تم پر کوئی دست درازی نہ کر سکیں۔

اس آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضرت ہارون علیہ السلام کی تائید و اعانت حاصل ہو جانے کو موسیٰ علیہ السلام کے بازوؤں کو قوی کر دینا سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اسی درخواست کو دوسری جگہ یوں بیان کیا گیا ہے۔

وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَهْلِیْ ۝ هٰرُوْنَ اَخِی ۝ اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِیْ ۝ وَاَشْرِكْهُ فِیْٓ اَمْرِیْ ۝ كَیْ نُسَبِّحَكَ كَثِیْرًا ۝ وَّنَذْكُرَكَ كَثِیْرًا ۝ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِیْرًا ۝ (20:29-35)

اور میرے گھر والوں میں سے میرے لیے ایک مددگار مقرر کر دے۔ یعنی میرے بھائی ہارون کو، کہ اس کے ذریعے سے تو میری کمرِ ہمت کو مضبوط کر دے اور اسے میرے کام میں میرا شریک بنا دے۔ تاکہ ہم دونوں مل کر کثرت کے ساتھ تیرے پروگرام کی تکمیل میں اپنی پوری قوت صرف کر سکیں اور تیرے قانون کو بکثرت اپنے پیشِ نظر رکھ سکیں۔ بلاشبہ تو ہمیں دیکھتا رہے گا کہ ہم کیا کرتے ہیں۔

یہاں بھی ہارون علیہ السلام کو اپنا معاون و مددگار (وزیر) اور کمرِ ہمت کی تقویت کا باعث اور پشت پناہ ظاہر کیا گیا ہے۔ مذکورہ بالا آیات سے ظاہر ہے کہ بھائی بھائی آپس میں ایک دوسرے کے لیے قوت بازو اور پشت پناہ ہوتے ہیں۔ ہر بھائی دوسرے سے طاقت حاصل کرتا ہے اور اس احساس سے ان کی جرأت اور ہمت لامحدود ہو جاتی ہے۔

(جاری ہے)

پرویز

طریق کار

مندرجہ ذیل خط کے مضمون سے ملتے جلتے خطوط ادارہ کو اب بھی موصول ہوتے ہیں۔ ایسے مراسلات کا جواب آج بھی وہی ہے جو پرویز صاحب نے قریباً چوالیس برس قبل درجِ ذیل مراسلہ کا دیا تھا۔ تبدیلی اور اس کے طریقِ کار پر یہ ایک جامع و مانع تحریر ہے جسے آپ کی نذر کیا جا رہا ہے۔

ذیل کا خط ملاحظہ فرمائیے:۔

مکرمی و محترمی جناب پرویزؔ صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کی کتاب "ISLAM A CHALLENGE TO RELIGION" پر ''پاکستان ٹائمز'' میں ریویو اور اس کے بعد اس پر ایک خط 25 اکتوبر 1969ء نظر سے گزرا۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر سوچنے والے شخص کے سامنے یہی سوال ہے کہ:

The only thing which is missing from it is the methodology of bringing into being the "Rububiyat Order" which forms the core of Mr. Parwez's social and political philosophy.

ذہن یہ باور ہی نہیں کرتا کہ آپ جو اتنے عرصے سے اس راہ کے مسافر ہیں' اس کے جواب سے معذور ہوں۔ آپ کے پاس یقیناً اس کا جواب ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ جواب اُس منزل سے پہلے ظاہر کر دیا جائے جس میں وہ جواب عمل میں لایا جا سکتا ہے۔ لیکن جو لوگ آپ کی طرح اس راہ پر چل رہے ہیں اور اس جگہ پہنچ گئے جہاں یہ سوال ان کے ذہن میں بھی پیدا ہو گیا (جیسے راقم الحروف اور اس کے چند ساتھی)۔ ان سے اس جواب کو ''چھپا کر رکھنا'' بھی ایک قسم کا بخل ہے جس کے آپ مرتکب نہیں ہو سکتے۔ اس لئے ازراہِ کرم مکمل طور پر یا چند سطور میں بطور مخلّص چند اشارات کی شکل میں راقم الحروف کو لکھ بھیجیں تو بندہ نوازی سے بعید نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو بیش از بیش علم و حکمتِ قرآنی سے نوازے۔ فقط والسلام!

مجھے اس مضمون کے کئی خطوط' کئی ایک دیگر احباب کی طرف سے بھی موصول ہوئے ہیں۔ اس بنا پر (نیز مسئلہ کی اہمیت کا بھی یہی تقاضا تھا) میں نے مناسب سمجھا ہے کہ ان احباب کو فرداً فرداً جواب دینے کے بجائے (ماہنامہ) طلوعِ اسلام

کی وساطت سے اس مسئلہ کی وضاحت کر دی جائے۔

میں سب سے پہلے محترم مستفسر کی خدمت میں عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ بات یہ نہیں کہ میں اس اہم سوال کے جواب کو اس منزل سے پہلے ظاہر نہیں کرنا چاہتا جس میں وہ جواب 'عمل' میں لایا جا سکتا ہو۔ میں نے جس مقصد کو اپنی زندگی کا مشن قرار دے رکھا ہے' اس میں کوئی راز ایسا نہیں جسے کسی خاص وقت تک کے لئے پوشیدہ رکھنا ضروری ہے ـــــ بلکہ یوں کہئے کہ اس میں راز کوئی بھی نہیں۔ اس میں تو کیفیت یہ ہے کہ ـــــ سخنے نکفتہ را چہ قلندرانہ گفتم ہے ـــــ اس قسم کی مصلحت کوشیاں' عملی سیاست کے میدان کے نبرد آزماؤں کے لئے ضروری ہوتی ہیں اور میں نے نہ اس میدان میں قدم رکھا ہے' نہ قدم رکھنے کا ارادہ ہے۔ اس لئے ہر چہ گویم قلندرانہ گویم۔ فالحمد للہ علی ذلک!

جہاں تک میری کتاب پر تبصرہ کے ضمن میں ان ریمارکس کا تعلق ہے جنہیں مندرجہ بالا خط میں دُہرایا گیا ہے' میں (محترم تبصرہ نگار سے معذرت کے ساتھ) جرأتِ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ان کے یہ ریمارکس بے محل تھے۔ میری کتاب کا موضوع یہ ہے کہ اسلام' ایک دین ہے' مذہب نہیں اور جب تک اسے مذاہبِ عالم کے زمرے سے الگ نہیں کیا جاتا' نہ اس کی حقیقت سمجھ میں آ سکتی ہے' نہ اس کا مقصود و منتہیٰ۔ کتاب کا بیشتر حصہ' مذہب اور دین کے بنیادی فرق کی وضاحت پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد' میں نے مثبت طور پر بتایا ہے کہ قرآنِ کریم جس دین' (یعنی نظامِ حیات) کو پیش کرتا ہے' اس کے اصولی خط وخال کیا ہیں اور وہ دیگر نظام ہائے حیات سے کس طرح مختلف اور متمیز ہے۔ کتاب کی ساری بحث فکری ہے اور وہ اسلام کا صحیح تصور پیش کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی کتاب کے سلسلہ میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اس میں اس نظام کو پاکستان میں عملاً متشکل کرنے یا نافذ کرنے کا طریقہ کیوں نہیں بتایا گیا۔

اس حقیقت سے ہر صاحبِ نظر واقف ہے کہ فکری راہنمائی اور عملی طریق کار دو الگ الگ شعبے ہیں۔ میں قرآنِ کریم کا ایک ادنیٰ سا طالب العلم ہوں اور اپنی فکری راہنمائی اسی سرچشمۂ ہدایت سے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ قرآنی راہنمائی زندگی کی مستقل اقدار اور اصولی حدود کی شکل میں ملتی ہے۔ یہ اقدار اور حدود غیر متبدل ہیں۔ قرآن وہ طریقے متعین نہیں کرتا جن کے مطابق ان اقدار و اصول کو ایک نظام یا معاشرہ کے محسوس پیکر میں منتقل کیا جائے گا۔ یہ طریقے حالات کے تقاضے کے مطابق' ہر دَور (بلکہ ایک ہی دَور کے مختلف اوقات) میں مختلف ہوں گے اور عند الضرورت ان میں تغیر و تبدل ہوتا رہے گا۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن نے ان طریقوں کو خود متعین نہیں کیا۔ یہ جو ہمارے ہاں' اسلامی نظام کے سمجھنے میں اس قدر الجھنیں پیدا ہو رہی ہیں' تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ لوگوں نے' ان طریقوں کو بھی جو کسی زمانے میں' اس وقت کی ضروریات کے مطابق' حصولِ مقصد کے لئے وضع اور اختیار کئے گئے تھے' قرآنی اصول و اقدار کی طرح غیر متبدل اور ابدی سمجھ رکھا ہے۔ وہ

طریقے' اب زمانے کے بدلے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتے' اور ہمارا قدامت پرست طبقہ ان میں کسی قسم کی تبدیلی کو خلافِ اسلام قرار دے دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ خود اسلام کے متعلق یہ خیال عام ہو رہا ہے کہ یہ کسی زمانے میں تو خوشگوار نتائج پیدا کر گیا تھا لیکن اب اس میں زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دینے کی صلاحیت نہیں' لہٰذا' ہمیں اس کے ساتھ چمٹے نہیں رہنا چاہئے۔ ایک قرآنی مفکر اس قسم کی غلطی نہیں کرتا۔ (یا یوں کہئے کہ اسے ایسی غلطی نہیں کرنی چاہئے)۔ وہ اپنے دَور کے مسائل پر غور کرتا اور ان کے متعلق جو قرآنی راہنمائی ملتی ہے' اسے فکری انداز سے قوم کے سامنے پیش کر دیتا ہے اور طریق کار ان لوگوں کے لئے چھوڑ دیتا ہے جو اس راہنمائی کے مطابق عملی عمارت استوار کرنا چاہیں۔ البتہ وہ اس باب میں اتنی احتیاط ضرور برتتا ہے کہ یہ دیکھے کہ جو عملی طریق اختیار کیا جائے وہ قرآن کے کسی اصول سے نہ ٹکرائے۔

یہ ہے وہ بنیادی حقیقت جسے نظر انداز کر دینے کا نتیجہ وہ اعتراض ہے جسے محترم تبصرہ نگار نے میری کتاب پر بھی وارد کیا ہے اور (دوسرے مقام پر) علامہ اقبالؒ پر بھی۔ ان کے متعلق بھی انہوں نے کہا ہے کہ اقبالؒ نے اپنے آپ کو فکری مباحث تک محدود رکھا اور حصولِ مقصد کے لئے عملی طریق کار تجویز نہ کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اقبالؒ کی دیدہ وری اور دور نگہی تھی جو انہوں نے ایک مفکر کے صحیح مقام اور منصب کو سمجھ لیا اور عملی طریق کار کو اس مردِ سیاستدان کے سپرد کر دیا جس کی فراست اور دیانت پر انہیں اعتماد تھا۔ انہوں نے اپنے کلام میں ایک آدھ مرتبہ عملی طریق تجویز کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اربابِ نظر سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ اس میں وہ اس مقام تک نہ پہنچ سکے جو بہ حیثیت مفکر انہیں حاصل تھا۔ اور اسی لئے انہوں نے پھر اس کی کوشش نہیں کی۔ کلامِ اقبالؒ میں ان کی مثنوی —— پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق —— کو ایک خاص مقام حاصل ہے —— بہت بلند مقام ——اس مثنوی کے نامؔ سے (جو ان کا اپنا تجویز کردہ ہے) واضح ہوتا ہے کہ اس وقت انہوں نے عملی طریق کار کے تعین کی اہمیت کو محسوس کیا تھا لیکن اس باب میں جو کچھ انہوں نے کہا وہ اس حقیقت کا غماز ہے کہ وہ ان کی آزادانہ فکری تخلیق نہیں تھا' ماحول کے اثرات کا نتیجہ تھا اور اسی لئے اسے چنداں اہمیت حاصل نہ ہو سکی۔ اُس زمانے میں مسٹر گاندھی کی سودیشی تحریک کا عام چرچا تھا۔ چنانچہ اقبالؒ نے بھی اپنی قوم سے کہا تو یہی کہ

آنچہ از خاکِ تو رُست اے مردِ حُر
آں فروش و آں بپوش و آں بخور
آں نکو بیناں کہ خود را دیدہ اند
خود گلیمِ خویش را بافیدہ اند

(مفہوم: اے آزاد انسان جو کچھ بھی تمہاری سرزمین کی خاک سے پیدا ہوتا ہے اُسی سے بنائی ہوئی

اشیائے صرف کو استعمال میں لاؤ۔ یعنی غیر ملکی اشیاء کا بائیکاٹ کرو کیونکہ جو لوگ خود آگاہ ہوتے ہیں وہ اپنی گدڑی خود ہی سیتے ہیں۔ س۔ا)

اور تاریخ اس پر شاہد ہے کہ (اقبالؒ کو اپنا فکری مرشد تسلیم کرنے کے باوجود) قائدِ اعظمؒ کی عملی سیاست کی نگہ نتائج شناس نے طریق کار کے اس مشورہ کو درخورِ اعتناء نہ سمجھا اور نہ اقبالؒ نے اس پر زور دیا —— قائدِ اعظمؒ تو ایک طرف خود مسٹر گاندھی نے دو ہی قدم آگے جا کر اس طریق کو گردِ کارواں کی طرح پیچھے چھوڑ دیا تھا —— حتیٰ کہ اہمساؔ (عدم تشدد) کو بھی جو اس کے نزدیک اس کے (مذہب) دھرم کا جزو تھا —— عملی سیاست کے تقاضے ایسے ہی ہوتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

اب آیئے ہم دیکھیں کہ قرآنی نظامِ ربوبیت جب (صدرِ اوّل میں) پہلی بار عملاً متشکل ہوا تھا تو اس کی صورت کیا تھی۔ لیکن اس سے پہلے، چند الفاظ میں اسے سمجھ لیجئے کہ اس نظام کی عمارت کس بنیاد پر استوار ہوئی تھی (اور استوار ہوگی)۔ وہ سنگِ تاسیس یہ تھا کہ

> ہر شخص اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق، مفوضہ امور کو نہایت محنت اور جانفشانی سے سرانجام دے اور اس کے ماحصل میں سے، بقدر اپنی ضرورت کے لے کر، باقی سب دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دیدے۔ بلکہ بعض حالات میں، دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر مقدم رکھے اور اس کا نہ کسی سے اجر مانگے نہ معاوضہ۔ حتیٰ کہ کسی کے شکریہ تک کا بھی متمنی نہ ہو۔

یہ تھا اس نظام کا سنگ بنیاد جو اسلام کا مطمحِ نظر تھا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ تصور، نہ صرف اس نظامِ سرمایہ داری کے خلاف تھا جو اس زمانے میں عام تھا، بلکہ انسان کی طبیعی زندگی کے جبلی تقاضا (INSTINCT) کے بھی خلاف۔ انسان کی طبیعی زندگی کا جبلی تقاضا، مفادِ خویش کا تحفظ ہے۔ اسے کسی دوسرے کے مفاد کی کوئی فکر اور پروا نہیں ہوتی۔ اس لئے جو تقاضا، قرآنی نظام کا سنگِ بنیاد قرار پاتا ہے، وہ اسے اس کے جبلی تقاضوں سے بلند لے جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ (حیوانی سطح پر زندگی بسر کرنے والے) عام انسانوں کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لئے خاص انداز کے انسان کی ضرورت ہے۔ اور انسانیت سازی درحقیقت قرآنی تعلیم کا مقصود ہے۔ اسی داخلی انقلاب سے وہ جذبۂ محرکہ پیدا ہوتا ہے جس سے انسان اتنے بڑے ایثار کے لئے بطیبِ خاطر تیار ہوسکتا ہے۔ اس نظام کی تشکیل کے لئے جب نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت کا آغاز کیا، تو اس وقت (حضورؐ کے سوا) دنیا میں کوئی مسلمان نہیں تھا۔ آپ ﷺ نے اس نظامِ نَو کے اصول و اقدار اپنی قوم کے سامنے پیش کئے اور پیش کرتے چلے گئے۔ قوم نے اس دعوت کی مخالفت کی لیکن ان میں ایسے افراد بھی تھے جنہوں نے اس پر سکون

واطمینان سے غور وفکر کیا اور اس کے بعد، جب وہ اس کی صداقت کے متعلق، دل اور دماغ کی کامل رضامندی سے مطمئن ہو گئے تو انہوں نے اسے قبول کرنے کا اقرار کر لیا۔ اور اس طرح اس سوسائٹی کے ممبر بن گئے جس کی طرف حضور ﷺ دعوت دیتے تھے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ اس زمانے میں وہی لوگ مسلمان کہلاتے تھے جو اپنے قلب و دماغ کے پورے اطمینان کے ساتھ، اس نظام کی صداقت کے قائل ہو چکے تھے۔

جو لوگ اس طرح اس سوسائٹی کے ممبر بنتے تھے، ان کی تعلیم و تربیت کا خصوصی انتظام خود نبیٔ اکرم ﷺ فرماتے تھے۔ قرآنِ کریم نے جو حضورؐ کی یہ خصوصیتِ کبریٰ بیان کی ہے کہ **یعلمھم الکتاب و الحکمۃ ویزکیھم** تو وہ اسی حقیقت کی وضاحت کرتی ہے۔ یعنی حضورؐ انہیں اس نظام کے قوانین وضوابط کی تعلیم دیتے تھے۔ اس کی حکمت وغایت سے آگاہ کرتے تھے اور اس طرح ان کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کرتے چلے جاتے تھے۔ ''صلاحیتوں کی اس نشوونما'' سے مراد صرف ذہنی صلاحیتیں نہیں، اس سے مفہوم ان صلاحیتوں کی نشوونما ارتقاء بھی ہے جن کی بنیادوں پر انسانی سیرت و کردار کی بلند و بالا عمارت استوار ہوتی ہے۔ اسے انسانی ذات کی نشوونما کہا جاتا ہے۔ اسی سے ابن آدم، حیوانی سطح سے بلند ہو کر انسانی سطح پر زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جاتا ہے اور یہی چیز جذبہ محرکہ بنتی ہے اس عظیم ایثار کا جس پر اس نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ جب ان میں سیرت و کردار کی اس قسم کی پاکیزگی اور پختگی پیدا ہو جاتی ہے، تو ان سے ایک عہد لیا جاتا ہے جو درحقیقت اسلامی نظامِ ربوبیت کی اساس ہے یعنی یہ عہد کہ

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ (9:111)

یہ حقیقت ہے (یونہی ذہنی عقیدت مندی نہیں) کہ مومنین نے اپنا مال اور اپنی جان خدا کے ہاتھوں فروخت کر دیئے ہیں اور خدا نے انہیں جنت کے عوض خرید لیا ہے۔

اسی جماعت کے افراد کو مومن کہا جاتا تھا۔ یعنی وہ لوگ:

(1) جنہوں نے سوچ سمجھ اور دیکھ بھال کر، برضا و رغبت، اس نظام کی صداقت کو قبول کیا۔

(2) ان کی تعلیم و تربیت خود رسولؐ اللہ نے فرمائی اور اس طرح ان کے قلب و نگاہ میں قرآنی اقدار کے مطابق انقلاب پیدا ہوتا چلا گیا۔ اور

(3) انہوں نے اپنی جان اور مال اسی نظام کے ہاتھ فروخت کر دیا۔

رسولؐ اللہ کی مکی زندگی پوری کی پوری اسی عمل تزمیل [1] (جماعت سازی) میں بسر ہو گئی اور تیرہ سال کے عرصہ میں جو

---

[1] رسولؐ اللہ کو اسی جہت سے قرآن میں المزمل کہا گیا ہے یعنی وہ جو رفقائے سفر کے انتخاب میں انتہائی کاوش و احتیاط سے کام لے۔

افراد اس سوسائٹی کے ممبر بنے' ان کی تعداد چند سو سے زیادہ نہ تھی۔ اگر ہم اپنے اندازوں کے مطابق ماپیں تو یہ پروگرام بڑا سُست خرام دکھائی دے گا۔ آپ غور کیجئے کہ حضوؐر کی عمرِ رسالت صرف تیئس سال تھی اور آپ کا عہدِ رسالت قیامت تک کے عرصہ کو محیط تھا۔ اس اعتبار سے حضوؐر کی حیاتِ طیبہ کا ایک ایک سانس صدیوں پر بھاری تھا۔ اس تیئس سال کے گراں بہا عرصہ میں سے تیرہ سال کی مدت ابتدائی عملِ تزمیل میں صرف ہوگئی اور اس کا ماحصل چند سو افراد سے آگے نہ بڑھا۔ اور حضوؐر کی طرف سے یہ سب کچھ نہایت سکون وسکوت کے ساتھ ہوا۔ جو حضرات بنیادی نظریات کی تبلیغ وتعلیم کے مرحلہ کو ''بے عملی'' سے تعبیر کرتے ہیں اور عمل کا تصور ان کے ہاں ہنگامہ خیزی اور شورش انگیزی ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک حضوؐر کی یہ تیرہ سالہ زندگی تو ''بے عملی'' کا دَور کہلائے گی!

اس جماعتِ مومنین کی مکی زندگی ایک اور اہم حقیقت کی بھی پردہ کشا ہے۔ لوٹ مار' جنگ وجدال' فتنہ وفساد' عربوں کی گھٹی میں پڑا تھا' اور اس جماعتِ نَو کے افراد انہی عربوں میں سے تھے۔ اس تیرا سال کے عرصہ میں' اس جماعت کے افراد پر ہر قسم کے مظالم ہوئے۔ انہیں نا قابلِ برداشت تکالیف اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن ان میں سے کسی نے نہ کسی قسم کا دنگا فساد کیا' نہ لڑائی جھگڑا' نہ کسی کو لوٹا نہ کھسوٹا' نہ کہیں پتھراؤ کیا نہ گھیراؤ۔ حتیٰ کہ نہ کہیں جھوٹ بولا نہ کسی کو فریب دیا' نہ کسی سے بدمعاملگی کی' نہ کسی قسم کی عہد شکنی۔ تکلیفیں برداشت کرتے رہے' مصیبتیں اٹھاتے رہے۔ لیکن فریق مقابل کے خلاف نہ جھوٹا پراپیگنڈہ کیا' نہ کسی قسم کی غلط بیانی سے کام لیا' نہ کوئی سازش کی' نہ زمین دوز تحریک چلائی۔ جو کچھ کہا کھلے بندوں کہا۔ جو کچھ کیا علی الاعلان کیا۔ اپنے کام سے کام رکھا۔ اور جب دیکھا کہ مکہ کے مقابلہ میں مدینہ کی فضاء اس نظام کے قیام کے لئے زیادہ سازگار ہے تو نہایت خاموشی سے ہجرت کر کے وہاں چلے گئے اور جاتے وقت بھی کسی کو کسی قسم کا دھوکا دیا' نہ خیانت کی۔

مدینہ گئے تو وہاں کسی سے حکومت نہیں چھینی۔ نہ ہی ایسا ہوا کہ کوئی بنی بنائی حکومت کسی نے ان کے حوالے کر دی ہو۔ وہاں انہوں نے اپنی مملکت قائم کی ـــــ ''مملکت قائم کی'' کے الفاظ ذرا وضاحت طلب ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ مملکت قائم کس طرح سے کی گئی تھی۔ اس کے لئے طریق کار کیا اختیار کیا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں قرآن پھر ایک اصول بیان کرتا ہے اور وہ اصول ایسا جامع ہے جس میں تمام تفاصیل خود بخود سمٹ کر آ جاتی ہیں۔ سورۃ النور میں ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ (24:55)

یعنی یہ مملکت نہ کسی سے چھین جھپٹ کر لی گئی تھی نہ کسی نے بطور بخشائش ہبہ کر دی تھی۔ یہ فطری نتیجہ تھی ان کے ایمان اور اعمالِ صالحہ کا ـــــ ایمان ـــــ یعنی اپنے نصب العین کی صداقت پر یقین محکم۔ اور اعمالِ صالحہ ـــــ قرآنی اقدار واصول کے اندر رہتے ہوئے' موقعہ اور محل کے مطابق مناسب اقدامات۔ (واضح رہے کہ قرآن نے ''اعمالِ صالحہ'' پر اتنا زور دیا ہے

لیکن ان اعمال کی کوئی جامع و مانع فہرست مرتب کر کے نہیں دی۔ حتیٰ کہ اس نے ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' کو جماعت مومنین اور مملکتِ اسلامیہ کا بنیادی فریضہ قرار دیا ہے لیکن (بجز چند احکام) معروف و منکر کی تفاصیل بھی خود متعین نہیں کیں۔

جب یہ جماعت صاحبِ اقتدار ہو گئی۔ یعنی وسائلِ رزق ان کے قبضہ میں آ گئے تو معاشرہ میں نظامِ ربوبیت خود بخود نافذ ہو گیا۔ بالفاظِ دیگر یوں کہئے کہ یہ کاروان' مختلف وادیوں میں سے گزرنے کے بعد' اپنی منزلِ مقصود تک جا پہنچا۔ اُس وقت نہ کسی نے یہ سوال اُٹھایا کہ مملکت تو مل گئی ہے' اب اس میں کس قسم کا نظام قائم کیا جائے۔ نہ یہ تنازعہ پیدا ہوا کہ فلاں قسم کا معاشی نظام اسلامی ہے یا غیر اسلامی ـــــ انہوں نے چلنے سے پہلے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ہم نے پہنچنا کہاں ہے۔ اس لئے منزلِ پر پہنچنے کے بعد' کسی کے دل میں یہ سوال نہ اُبھرا کہ یہ ہماری منزلِ مقصود ہے یا نہیں۔ ان میں سے ہر فرد جو اس سوسائٹی کا ممبر بنا تھا' سب کچھ دیکھ بھال' سوچ سمجھ کر' ممبر بنا تھا۔ ان میں سے ہر ایک کو معلوم تھا ـــــ اور حتمی اور یقینی طور پر معلوم' کہ اس سوسائٹی کا مقصود و منتہیٰ کیا ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے ہمارا فریضہ کیا۔ یہ افراد' اس سوسائٹی کا ممبر بننے کے بعد' اپنے آپ کو' اُس مقصد کے حصول کے لئے تیار کرنے اور اس کے اہل بننے میں مصروف رہے۔ جب انہوں نے اپنے اندر اس کی اہلیت پیدا کر لی' تو مقصد حاصل ہو گیا۔ یعنی اسلامی نظام قائم ہو گیا۔ اس کے بعد یہ لوگ اس نظام کے استحکام و فروغ اور اندرونی اور بیرونی خطرات سے اس کی حفاظت و مدافعت کے لئے مصروفِ جدوجہد رہے۔ یہ ہے وہ ''طریق'' جس کے مطابق صدرِ اوّل میں یہ نظام قائم ہوا۔ یعنی اس نظام کے اصول و اقدار کو بہ دلائل و براہین دوسروں کے ذہن اور دل نشین کرانا' اور جو اس طرح ان کی صداقت تسلیم کر لیں' مناسب تعلیم و تربیت سے' ان کی انسانی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنا' یہی ہے وہ پروگرام جسے میں نے شروع میں انسانیت سازی سے تعبیر کیا ہے۔

☆.....☆.....☆

اب آپ تاریخ کے اوراق کو چودہ سو سال آگے اُلٹ کر' پاکستان کی طرف آ جایئے۔ یہاں ایک ایسی قوم بستی ہے جو مسلمان کے نام سے متعارف تو ہے لیکن:

(1) ان میں سے نہ کسی نے' اسلام کو سوچ سمجھ کر اور دیکھ بھال کر' دل اور دماغ کے کامل اطمینان کے ساتھ' بطیبِ خاطر اختیار کیا ہے۔

(2) نہ ہی ان کے سامنے اسلام کا کوئی واضح اور متعین مفہوم ہے۔

(3) نہ ہی انہیں حتمی طور پر معلوم ہے کہ اسلامی نظام کسے کہتے ہیں اور اس کا مقصود و منتہیٰ کیا ہے۔ اور جو اسلام ان کے ہاں مروّج ہے' وہ' وہ مذہب ہے جو انفرادی اور گروہی مفادات کے تحفظ کے لئے ہمارے دورِ ملوکیت میں وضع کیا گیا۔

(4) نہ ہی (صدرِ اوّل کے مسلمانوں کی طرح) ان کی تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام ہوا ہے۔

(5) نہ ہی انہوں نے اپنے مقصد کے حصول کے لئے اپنی جان اور مال کو کسی کے ہاتھ فروخت کر دینے کا معاہدہ کیا ہے۔ اور

(6) نہ ہی یہ مملکت انہیں ان کے ایمان و اعمالِ صالح کے نتیجہ میں ملی ہے۔

یہاں حالت یہ ہے کہ:

(1) یہ قوم متفق علیہ طور پر اتنا بھی نہیں بتا سکتی کہ مسلمان کہتے کسے ہیں۔

(2) کوئی معاملہ پیش آئے۔ ایک گروہ اسے اسلامی قرار دیتا ہے اور دوسرا غیر اسلامی۔ کوئی اسے جائز ٹھہراتا ہے کوئی ناجائز؛ ذرا ذرا سی بات پر ان میں باہمی سر پھٹول ہوتی ہے۔ ان کی بیویوں پر طلاق پڑتی ہے؛ ان پر کفر کے فتوے صادر ہوتے ہیں اور کوئی اتھارٹی ایسی نہیں جسے متنازعہ معاملات میں حکم تسلیم کیا جاتا ہو۔

اور تماشہ یہ کہ کوئی اس باب میں (SERIOUS) نہیں کہ اس راہ گم کردہ قافلہ کے لئے منزل کا تعین اور راستے کی وضاحت کی جائے۔ ایک طرف حکومتیں آتی رہیں اور جاتی رہیں اور ان میں سے ہر ایک کی کوشش یہ رہی کہ مملکت کا نام اسلامی رکھ کر اور آئین میں یہ شق داخل کر کے کہ ملک کا کوئی قانون اسلام (یا کتاب و سنت) کے خلاف نہیں ہوگا؛ مُلّا سے جان چھڑاؤ اور عوام میں سستی شہرت حاصل کرو۔ دوسری طرف؛ اربابِ مذہب کی یہ کیفیت کہ اُن میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جنہوں نے اسلام کے لفظ کو اپنی مفاد پرستیوں کے لئے سپر بنا رکھا ہے اور کچھ وہ جو ''مذہبی علوم'' سے تو واقف ہیں لیکن اسلام کی حقیقت سے قطعاً نا آشنا ہیں اور نہ خود؛ جہالت کی تاریکی سے نکلنا چاہتے ہیں؛ نہ اپنے معتقدین کو نکلنے دینا چاہتے ہیں۔ ان کے بعد ایک گروہ ایسا بھی ہے جو (مذکورہ بالا حالات سے متأثر ہو کر) اس نتیجہ پر پہنچ چکا ہے کہ اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؛ اب یہ ہمارے کسی کام نہیں آ سکتا۔ یہ گروہ دل میں تو اس کا قائل ہے؛ لیکن معاشرتی دباؤ کے ماتحت اپنے اس عقیدہ کو اعلانیہ زبان تک لانے کی جرأت نہیں کرتا —— یہ حضرات؛ ڈرائنگ رومز میں بیٹھے؛ گھنٹوں ان خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں اور اس کے بعد اُٹھ کر سیدھے ''داتا صاحب'' پہنچ جاتے ہیں۔

یہ ہے یہاں کی مسلمان قوم اور یہ ہیں اس قوم اور ملک کے حالات! اور اس کے بعد مجھ سے پوچھا جاتا ہے کہ (تم نے قرآن پر غور و فکر کیا ہے) تم بتاؤ کہ (اس قوم میں کسی قسم کی تبدیلی کئے بغیر) یہاں قرآن کا معاشی نظام (نظامِ ربوبیت) کس طرح نافذ کیا جائے؟

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا!

اگر کسی نے پوچھنا ہے تو یہ پوچھے کہ (اقبالؔ کے الفاظ میں) اس ''مسلمانے نامسلمانے'' کو ''مسلمان'' کس طرح بنایا

جائے تاکہ اس کے بعد یہاں کا معاشرہ، قرآنی معاشرہ میں بدل جائے اور موجودہ غلط معاشی نظام کی جگہ نظامِ ربوبیت آجائے۔ نظامِ ربوبیت، کوئی خودکار مشین نہیں، جسے کہیں سے امپورٹ کرکے یہاں نصب کردیا جائے اور سوئچ دبا دینے سے وہ چلنے لگ جائے۔ نظامِ ربوبیت، دل کی گہرائیوں سے اُبھرنے والی، اُمنگوں کے محسوس پیکر کا نام ہے اور یہ کسی ایسی قوم میں نفاذ پذیر نہیں ہوسکتا جس کے اعماقِ قلب میں اس قسم کی تبدیلی نہ پیدا ہوئی ہو۔ ہم تو نسلی مسلمان ہیں۔ جو بدوؔ اسلامی مملکت کے قیام کے بعد (دل کی تبدیلی کے بغیر، کسی اور تقاضا سے) حلقہ بگوشِ اسلام ہوگئے تھے، قرآن نے ان کے متعلق کہہ دیا تھا کہ ـــ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ـــ یہ بدو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ قُلْ۔ ان سے کہہ دو۔ لَّمْ تُؤْمِنُوْا۔ تم ایمان نہیں لائے۔ اس لئے ایسا مت کہو۔ وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا ـــ تم صرف یہ کہو کہ ہم اس نظام کے سامنے جھک گئے ہیں۔ اس لئے کہ وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ۔ ایمان ہنوز تمہارے دل کی گہرائیوں میں نہیں اُترا۔ اس کے بعد، جب تمہاری مناسب تعلیم وتربیت ہوجائے گی اور تم، اپنے دل کی کامل رضامندی سے، اس نظام کی اطاعت کروگے، تو پھر تمہارے اندر وہ تبدیلی پیدا ہوجائے گی جسے ایمان کہہ کر پکارا جاتا ہے (49:14)۔

آگے بڑھنے سے پہلے، میں اس حقیقت کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ ہم مسلمان، اگر قلب ونگاہ کی تبدیلی سے مسلمان نہیں ہوئے، تو اس کے یہ معنی نہیں کہ میں موجودہ مسلمانوں کی قومی (اجتماعی) زندگی کو بیکار سمجھتا ہوں۔ بالکل نہیں۔ جب کوئی قوم، اقدار (یا آئیڈیالوجی) کے اشتراک کی بنا پر، اپنی اجتماعیت سے محروم ہوجائے لیکن وہ اس کے باوجود انفرادی زندگی کے بجائے اجتماعی زندگی بسر کرنا چاہے، تو اس کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنی وجہِ تعارف کو اپنی اجتماعیت کی بنیاد قرار دے لے اور اس طرح اپنے افراد کو تنکوں کی طرح منتشر ہونے سے بچالے۔ اس قسم کی اجتماعی زندگی، انفرادی زندگی سے بہرحال بہتر ہوتی ہے بشرطیکہ اس سے، دوسروں کے خلاف نفرت کے جذبات اور سلب ونہب کی ہوس نہ اُبھرے۔ میں نے، تقسیم ہند سے پہلے، مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ کو برقرار رکھنے اور اسے مستحکم کرنے کے لئے (اپنی بساط کے مطابق) جو کچھ کیا اس کا جذبۂ محرکہ یہ تھا کہ قوم کی اس ہیئت کو بہرحال قائم رکھا جائے تاکہ اس اجتماعیت سے اگر ہمیں ایک آزاد خطۂ زمین حاصل ہوجائے تو اس میں قرآنی نظام کے قیام کا امکان ہو۔ ہندوستان کا ایک جزو رہتے ہوئے اس کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔

اور تقسیم ہند کے بعد، میں نے اس امکان کو مشہود بنانے کے لئے جدوجہد شروع کردی۔ اس کے لئے کرنے کا کام یہ تھا کہ (جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے) اس ''مسلمانِ نامسلمانے'' کو مسلمان بنا دیا جائے ـــ وہ مسلمان جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا کہ:

''زباں'' سے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں!

میں نے اس کے لئے' سنتِ رسولؐ اللہ کے اتباع میں' طریقہ وہی اختیار کیا جسے حضورؐ نے اپنی دعوت کے آغاز میں اختیار فرمایا تھا۔ یعنی میں نے:

(1) سب سے پہلے' اپنی قوم سے کہا کہ ہمارا مروّجہ اسلام' دین نہیں رہا' مذہب میں تبدیل ہو چکا ہے۔ اسے جب تک دین میں تبدیل نہیں کیا جائے گا' مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہوں گے۔ میں نے گذشتہ بیس بائیس سال میں جو ہزار ہا صفحات لکھے ہیں' تقریریں کی ہیں' درس دیئے ہیں' وہ سب اسی مقصد کے لئے تھے۔ میں نے پہلے دین اور مذہب میں فرق کر کے بتایا اور پھر مثبت طور پر دینؔ کا قرآنی تصور قوم کے سامنے پیش کیا۔ اس کے ساتھ ہی' جو اہم معاملہ قوم کے سامنے آیا' اس کے متعلق وضاحت سے بتایا کہ قرآن اس باب میں کیا راہنمائی دیتا ہے۔

(2) میں نے اربابِ بست وکشاد اور اصحابِ فکر ونظر سے کہا کہ موجودہ مسلمانوں سے (جیسے کچھ بھی ہیں) مملکتِ پاکستان کو محفوظ رکھنے اور مستحکم بنانے کا کام لیا جائے' لیکن ہماری نئی نسلوں کی تعلیم وتربیت کا ایسا انتظام کیا جائے جس سے ان کے قلب ونگاہ میں وہ تبدیلی پیدا ہو جائے جسے ایمانؔ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ ہوگی وہ قوم جسے صحیح معنوں میں ''ملتِ اسلامیہ'' کہہ کر پکارا جائے۔ اس ملت کے وجود میں آجانے سے اسلامی معاشرہ وجود میں آجائے گا اور انہی کے قلوب سے ابھرنے والی امنگوں سے نظامِ ربوبیت قائم ہوگا۔ اس کے لئے عملی طریق کیا اختیار کیا جائے گا' اسے' وہ ملت' اس وقت کے حالات کے مطابق' خود طے کر لے گی۔

یہ ہے اسلامی نظام قائم کرنے کا وہ طریقہ جسے میں اپنی قرآنی بصیرت کے مطابق سمجھ سکا ہوں اور جسے منہاجِ رسالت پر تدبر وتفکر کے بعد میں نے (اپنی استعداد کے مطابق) اختیار کر رکھا ہے' اس فرق کے ساتھ کہ حضورؐ نے تبلیغ دین کے ساتھ' ایک الگ جماعت (اُمت) کی تشکیل بھی فرمائی تھی اور میں نے الگ جماعت سازی سے سخت اجتناب کیا ہے اور اپنے آپ کو صرف ایک مبلغ کی حیثیت تک محدود رکھا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ ایک رسولؔ اپنے پیغام کے نہ ماننے والوں کو کافر قرار دیتا ہے اور جو لوگ اس پیغام کی صداقت کو قبول کر لیتے ہیں انہیں' ان کو کفار سے الگ کر کے' ایک متمیز اُمت کی تشکیل کرتا ہے۔ لیکن میں تو پوری کی پوری اُمتِ محمدیہ کو' دنیا کے جملہ غیر مسلموں (کفار) کے مقابلہ میں' ایک جماعت سمجھتا ہوں' اس لئے اس امت کے اندر' کافر و مسلم کی تفریق کا تصور بھی میرے نزدیک معصیتِ کبریٰ اور جرمِ عظیم ہے۔ امتِ محمدیہ کے اندر کافر و مسلم کی تفریق تو ایک طرف' قرآنِ کریم' اس امت کے اندر فرقہ بندی کو بھی شرک قرار دیتا ہے (30:31)۔ اور رسولؐ اللہ سے کہتا ہے کہ ایسا کرنے والوں کے ساتھ تمہارا کوئی تعلق نہیں رہے گا (6:160)۔ اس لئے میں ایک الگ جماعت بنانے کی جرأت کیسے کر سکتا ہوں۔ میں دین کے متعلق قرآنی تصورات کو عام کئے جا رہا ہوں اور جو لوگ ان تصورات سے متفق ہو جاتے ہیں' ان سے کہتا ہوں کہ وہ بھی اسی طرح انہیں عام کرتے جائیں تا کہ ہماری پوری قوم کے سامنے دین کے

صحیح تصورات آ جائیں۔ اسی طرح جب میں' قوم کی نئی نسل کے لئے قرآنی تعلیم و تربیت پر زور دیتا ہوں اور اب (بال آخر) خود ایک درسگاہ قائم کرنے کی تجویز کو آگے بڑھا رہا ہوں' (افسوس کہ درس گاہ کا خواب کبھی پورا نہ ہو سکا۔ س۔ا) تو یہ بھی پوری قوم کے بچوں کے لئے کر رہا ہوں' کسی خاص گروہ یا پارٹی یا کسی خاص طبقہ کے بچوں کے لئے نہیں۔ میرا منصب مسلمانوں کے سامنے اس دینؔ کا صحیح تصور لانا ہے جس کی طرف نسبت سے وہ (اور ہم) اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔ جب ان کے سامنے دینؔ کا تصور آ جائے گا اور ان کے دل و دماغ میں قرآنی تبدیلی پیدا ہو جائے گی' تو وہ' موجودہ غیر اسلامی نظامِ زندگی کو قرآنی نظام میں بدلنے کے لئے طریق کار خود تجویز کر لیں گے۔ یہ ہے میرا مشن۔

من از طریق نہ پرسم' رفیق می جویم
کہ گفتہ اند' نخستیں رفیق باز طریق!

(مفہوم: میں راہ نہیں پوچھتا' میں تو ہم راہ ڈھونڈ رہا ہوں ضرب المثل ہے کہ پہلے رفیق پھر طریق!

س۔ا)

اس سلسلہ میں مجھ سے اکثر کہا جاتا ہے کہ جس منزل کی تم نے نشاندہی کی ہے' اس سے تو ہم متفق ہیں لیکن اس تک پہنچنے کے لئے جو راستہ تم تجویز کرتے ہو وہ بہت لمبا ہے اور زمانہ آج بڑی برق رفتاری سے آگے بڑھ رہا ہے۔ اس لئے یہ تو ـــــ تا تریاق از عراق آوردہ شود' مار گزیدہ مردہ شود ـــــ والا معاملہ ہے۔ اس کے لئے کوئی (SHORT-CUT) ہونا چاہئے۔

یہ اعتراض (بظاہر) بڑا وزنی دکھائی دیتا ہے اور میں نے دیکھا ہے کہ اکثر عجلت پسند طبائع اس سے متأثر بھی ہو جاتی ہیں' لیکن مشکل یہ ہے کہ قرآنِ کریم (یا اسوۂ رسولؐ اللہ) سے مجھے کوئی (SHORT CUT) ملتا نہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے' قرآن کے تجویز کردہ راستے کی لمبائی اور رفتار کی (بظاہر) سُستی کا اندازہ اس سے لگ سکتا ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ کی گراں قدر عمرِ رسالت کا قریب ساٹھ فیصد حصہ' مکی زندگی کے تبلیغی مرحلہ میں گزرا اور اس کا ماحصل چند سو نفوس سے زیادہ دنیا کے سامنے نہ آیا۔ اس کے بعد مدنی زندگی کا ابتدائی دَور بھی' مخالفتوں کے ہجوم کے مقابلہ اور مدافعت میں گزرا۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اس محنتِ شاقہ سے کاشت کردہ کھیتی کو اپنے سامنے برومند ہوتا دیکھنے کی آرزُو خود حضورؐ کے دل میں بھی بیدار ہوتی لیکن بارگاہِ خداوندی سے جواب ملتا کہ وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (13:40)۔ ''جو کچھ ان لوگوں سے کہا جاتا ہے اگر اس کا کچھ حصہ تیری زندگی میں سامنے آ جائے' یا تو اس سے قبل ہی وفات پا جائے' تو اس سے تیرے پروگرام پر کچھ اثر نہیں پڑنا چاہئے۔ تیرا کام یہ ہے کہ تو اس پیغام کو لوگوں تک پہنچائے چلا جا۔ یہ دیکھنا ہمارا کام ہے کہ ہمارے قانونِ مکافات کی رُو سے اس کے محسوس نتائج کب سامنے آتے ہیں''۔

آپ نے غور فرمایا کہ داعیٔ انقلاب کی اس معصوم وحسین آرزو کے باوجود کوئی چھوٹا متبادل راستہ تجویز نہیں کر دیا گیا۔ ''تبلیغ'' کا وہی طول طویل پروگرام برقرار رکھا گیا اور اسی پر مستقل مزاجی سے عمل پیرا رہنے کی تاکید کی گئی۔ جب راستے کی طوالت کو حضور رسالت مآبؐ کے لئے بھی مختصر نہیں کیا گیا تو ہم آپ کس قطار شمار میں ہیں۔ خدا کے مقرر کردہ قوانین اٹل ہیں اور ان میں کسی کی خاطر بھی تغیر وتبدل نہیں ہوسکتا۔

لہٰذا ہمارے لئے دو ہی راستے ہیں۔ اگر ہم نے قرآن کی متعین کردہ منزل تک پہنچنا ہے ـــــ یعنی اپنے ہاں قرآنی نظامِ ربوبیت نافذ کرنا ہے تو اس کے لئے پروگرام بھی وہی اختیار کرنا ہوگا جسے قرآن نے تجویز کیا ہے۔ یعنی قلب ونگاہ کی تبدیلی سے ''مسلمانِ نامسلمانے'' کو مسلمان بنانا' تاکہ وہ نظام اس کے ایمان واعمالِ صالح کے فطری نتیجہ کے طور پر متشکل ہو سکے۔ اس راستے کو قرآن نے العقبۃ سے تعبیر کیا ہے یعنی پہاڑ کی گھاٹی پر چڑھنا ـــــ پہاڑ کی گھاٹی پر تیز قدمی سے چڑھا جا ہی نہیں سکتا۔

ویسے اگر کوئی ہنگامی طور پر قرآن کے معاشی نظام کو یہاں نافذ کرنا چاہتا ہے' تو اسے حکومت قانوناً نافذ کر سکتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مفاد پرست گروہ اسے جبر سے تعبیر کرے گا لیکن قانوناً اسے جبر نہیں کہا جا سکے گا۔ اس لئے کہ جب مسلمان' قرآن پر ایمان رکھنے کا اقرار کرتے ہیں تو قرآن کے کسی حکم کی اطاعت کو وہ جبر کس طرح کہہ سکتے ہیں؟ لیکن یہ محض ایک ہنگامی اور وقتی تدبیر ہوگی۔ اسے نہ دوام وثبات حاصل ہو سکے گا اور نہ ہی دیانت دارانہ طور پر عمل ہوگا۔ دیانتدارانہ عمل اسی قانون پر ہوسکتا ہے جس کا تقاضا انسان کے دل سے اُبھرے۔ خارج سے وارد کردہ قوانین کی اطاعت طوعاً وکرہاً ہی کی جاتی ہے اور جن لوگوں کے مفاد پر اس سے زد پڑتی ہو' وہ ہر وقت اس سے گریز کی راہیں تلاش کرنے یا تراشنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ اسے دوام وثبات اسی صورت میں حاصل ہو سکے گا جب یہ اس قوم کے ہاتھوں متشکل ہو جس کے قلب ودماغ میں وہ تبدیلی آ چکی ہو جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ اس کا بھی انتظام رکھے کہ ان آنے والی نسلوں کی ذہنیت بھی قرآنی سانچوں میں ڈھلتی رہے (جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں) قرآنی نظامِ ربوبیت کی بنیادی اینٹ یہ ہے کہ

> ہر شخص اپنی صلاحیتوں کے مطابق' مفوضہ کام کو پوری پوری محنت سے سرانجام دے اور اس کے ماحصل میں سے بقدر اپنی ضروریات کے لے کر باقی سب دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے دے دے۔ بلکہ ہنگامی اوقات میں' دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضرورت پر ترجیح دے۔

آپ سوچئے کہ ایسا نظام جس کا سنگِ تاسیس یہ ہو' قلب ونگاہ کی تبدیلی کے بغیر کسی صورت میں قائم ودائم رہ سکتا ہے اور قلب ودماغ میں اس قسم کی تبدیلی پیدا کرنے کے لئے تو یقیناً وقت لگے گا اور اس مدت کو ہمیں ہمت اور حوصلہ سے برداشت کرنا پڑے گا۔

لیکن اگر ہم اتنے لمبے وقت کا انتظار نہیں کر سکتے' تو پھر ہمیں قرآنی منزل کو اپنے سامنے رکھنا ہی نہیں چاہئے۔ سیدھے

طور پر اپنی منزل آپ متعین کر لینی چاہئے اور اس تک پہنچنے کے راستے بھی خود ہی تجویز کر لینے چاہئیں۔ لیکن پھر دیانتداری کا تقاضا ہے کہ ہم اس پر اسلام کا لیبل نہ لگائیں۔ میں نے ملک کے ذمہ دار حضرات سے شروع ہی میں کہا تھا کہ جب وہ اسلام، اسلام پکارتے ہیں تو انہیں چاہئے کہ پہلے اچھی طرح سمجھ لیں کہ اس سے مراد کیا ہے۔ اس کے بعد وہ فیصلہ کریں کہ کیا اسلام کو نظامِ حیات بنانے کی ہم میں ہمت ہے۔ اگر ہے تو پھر کسی قسم کی مخالفت کی پروا کئے بغیر، اس راستے پر گامزن ہو جایئے۔ لیکن اگر وہ سمجھیں کہ اس قسم کے نظام کا قیام ان کے بس کی بات نہیں، تو وہ کھلے بندوں اس کا اقرار کر کے، دیگر اقوامِ عالم کی طرح اپنے ہاں سیکولر نظام رائج کر لیں۔ اس سے وہ اگر مقامِ مومن تک نہیں پہنچ سکیں گے تو انہیں کم از کم مقامِ آدمیت تو نصیب ہو جائے گا۔ لیکن انہیں، نہ اس نظام کے قیام کی ہمت ہوئی نہ اس اقرار کی جرأت۔ نتیجہ اس کا وہ منافقت ہے جو اب قوم کے بیشتر حصہ کا شعار بن چکی ہے اور جس سے ہم جہنم کے ''اسفل'' میں پہنچ چکے ہیں۔

شباشب انقلاب لانے کے متمنی حضرات ذرا اتنا سوچیں کہ ہمارے پیش نظر تو قرآنی انقلاب ہے جو مظہر ہوتا ہے افرادِ قوم کے قلبی اور ذہنی انقلاب کا۔ اگر ہم ان تحریکوں کی تاریخ پر بھی غور کریں جو معاشرہ کی کسی ایک شق میں تبدیلی پیدا کرنے کے لئے وجود میں آئی تھیں تو ہم دیکھیں گے کہ انہیں ابھی اپنے نظریات کی تبلیغ اور ان کے مطابق ذہنیتوں میں تبدیلی کے لئے سالہا سال (بلکہ بعض اوقات صدیوں تک) کا عرصہ لگ گیا اور اس کے بعد جا کر کہیں ذرا سی تبدیلی ہو سکی۔ سطح بین نگاہیں ان تحریکوں کا مشاہدہ اس وقت کرتی ہیں جب وہ نظری انقلاب کی طول طویل مسافت طے کر چکنے کے بعد، ظہورِ نتائج کے مرحلہ میں داخل ہو جاتی ہیں، اس لئے وہ سمجھتی ہیں کہ انقلاب شباشب آ جاتا ہے۔ یہ ان کی نگاہ کی بھول ہوتی ہے۔ انہیں کیا علم کہ قطرے کو گہر ہونے تک کس کس قسم کے ''حلقۂ صد کامِ نہنگ'' سے گزرنا پڑتا ہے۔

ایک جلنے کے سوا اور کوئی کیا جانے
حالتیں کتنی گزر جاتی ہیں پروانے پر

ان تحریکوں کی نقالی کرنے والے بھی، اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور وہ تحریک کی صدیوں پر پھیلی ہوئی نہایت صبر آزما اور ہمت طلب لیکن خاموش و پرسکوت مسافت سے صرفِ نظر کر کے، آغازِ کار اس مرحلہ سے کر دیتے ہیں جہاں اس تحریک کی نمود محسوس پیکروں میں ہوئی تھی۔ نتیجہ اس کا انقلاب نہیں فساد ہوتا ہے —— یعنی تخریب بلا تعمیر!

قرآن، مستقل اقدار کی رُو سے انقلاب کا پیامبر ہے اور فساد کو بدترین جرم قرار دیتا ہے اور اس قسم کے انقلاب کے لئے وہ دل اور دماغ دونوں کے انقلاب کو شرطِ لاینفک قرار دیتا ہے خواہ اس میں کتنا ہی وقت کیوں نہ لگ جائے۔

اور قرآن کے اسی انقلاب کا میں مبلغ ہوں اور اس کے لئے اُسی کے تجویز کردہ راستہ پر گامزن —— جو احباب مجھ سے کسی اور طریق کے متقاضی اور متمنی ہیں، میں ان کی خدمت میں اس سے زیادہ اور کیا عرض کر سکتا ہوں کہ

زمانگاہ طلب' کیمیا چہ می جوئی!

(مفہوم: تُو مُجھ سے دیکھنے والی نگاہ حاصل کر۔ کیمیا گری کے نسخے کیوں تلاش کرتا ہے۔ س۔ا)

بعض احباب کہتے ہیں کہ جس منزل کی تم نے نشاندہی کی ہے' وہ بھی درست ہے اور اس تک پہنچنے کا جو طریق تم تجویز کرتے ہو ہمیں اس سے بھی اتفاق ہے' لیکن تم نے اپنا مخاطب تعلیم یافتہ (INTELLECTUALS) عوام کا طبقہ قرار دے رکھا ہے حالانکہ موجودہ غلط معاشرہ میں سب سے بری حالت عوام کی ہے' اس لئے تمہیں چاہئے کہ عوام (MASSES) میں جا کر اپنے پیغام کی تبلیغ کرو۔ انقلاب عوام کے لانے سے آئے گا۔

میں اس وقت اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتا کہ قرآنی انقلاب عوام کے لانے سے آتا ہے یا اربابِ فکر و نظر کے قلب و دماغ میں تبدیلی پیدا کرنے سے۔ میں ان حضرات سے' جو سمجھتے ہیں کہ اصل کام کرنے کا میدان عوام کا طبقہ ہے' عرض کروں گا کہ جب بات آپ کے سامنے اس قدر واضح طور پر آ چکی ہے تو پھر آپ اُٹھ کر اس کے مطابق کام کیوں نہیں کرتے؟ آپ مجھ سے تقاضا کیوں کرتے ہیں کہ میں اپنا اختیار کردہ پروگرام ترک کر کے' اس پروگرام کو اختیار کروں جسے آپ بہتر قرار دیتے ہیں۔ ایک مامور من اللہ (رسول) کی تو یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اس کی زندگی میں کوئی دوسرا کسی متبادل راستے کو اختیار نہیں کر سکتا لیکن میں تو نہ مامور من اللہ ہوں اور نہ ہی میں نے اس انقلاب آفرینی کا اجارہ لے رکھا ہے۔ میں نے بطیب خاطر' اپنے لئے زندگی کا ایک مشن تجویز کر رکھا ہے اور اسی پر میں گامزن ہوں۔ جو احباب میرے اس مشن کے ساتھ اتفاق کر کے میرے رفیق سفر بنتے ہیں' میں ان کی رفاقت کو شکریہ کے ساتھ قبول کرتا ہوں' جنہیں اس سے اختلاف ہوتا ہے' ان سے بصد معذرت عرض کر دیتا ہوں کہ آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں اور اپنے لئے جو نسا راستہ بہتر خیال کریں اسے اختیار کر لیں۔ اب آپ سوچئے کہ جو حضرات اس کے باوجود یہ اعتراض کئے جائیں کہ تم ہمارا تجویز کردہ راستہ کیوں اختیار نہیں کرتے' میں انہیں کیا جواب دوں۔ میرا تجربہ تو یہ ہے کہ اس قسم کے اعتراضات وہی لوگ کرتے ہیں جو خود کوئی تعمیری کام نہیں کر سکتے اور دوسروں کی تنقیص و تنکیر سے اپنے آپ کو اس خود فریبی میں مبتلا رکھتے ہیں کہ ہم بہت بڑا کارنامہ سرانجام دے رہے ہیں۔ کام کرنے والا اگر کسی راستے کو غلط سمجھتا ہے تو اسے چھوڑ کر کسی دوسرے راستے پر گامزن ہو جاتا ہے۔ وہ یہ نہیں کرتا کہ خود ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائے اور دوسروں کے پروگرام میں نقص نکال کر عمر بھر یہ شکایت کرتا رہے کہ وہ اس کے تجویز کردہ راستے کو کیوں اختیار نہیں کرتے۔

یہ ہے میرا مسلک' جس پر میں کاربند چلا آ رہا ہوں اور کاربند رہنا چاہتا ہوں کیونکہ میں اپنی قرآنی بصیرت کے مطابق اسی کو صحیح سمجھتا ہوں۔

والسلام! پرویز

تخلیق وارتقائے کائنات۔۔۔سائنس اور قرآن کی روشنی میں

(جو میں نے سمجھا)

قرآنِ کریم میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے دو جہانوں کا ذکر کیا ہے۔ایک عالم امر جس کی نسبت سے اللہ تعالیٰ اپنے آپ کو فاطر اور بدیع کہتے ہیں اور دوسرا عالم خلق جس کی وجہ سے اللہ سبحانہٗ خالق کہلاتے ہیں۔

عالمِ امر، وہ عالم ہے جس میں اللہ کا ارادہ ہی کارفرما ہوتا ہے۔قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ صرف ''کُن'' کہنے سے کام ہوجاتا ہے۔ایسا صرف ہمیں سمجھانے کے لیے کہا گیا ہے ورنہ اللہ کو کُن کہنے کی ضرورت نہیں۔یہاں اللہ جو چاہتے ہیں وہ کرتے ہیں۔(القرآن)

البتہ جب عالمِ خلق وجود میں آیا تو اس کے قاعدے اور قوانین بھی بنائے گئے۔اس کا سارا نظام انہی قوانین کی زنجیروں میں جکڑا ہے۔حتیٰ کہ اللہ جل جلالہٗ بھی اپنے بنائے ہوئے قوانین کو تبدیل نہیں کرتے (لَا تَبۡدِیۡلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ ؕ (10:64))۔اس نظام کے تحت کوئی واقعہ بھی عقل سے ماوراء نہیں ہوتا۔محیر العقول واقعات جنہیں ہم کرشمہ، کرامت یا جادو کہتے ہیں وہ دراصل اس وقت ہماری عقل کی گرفت میں نہیں آئے۔جوں جوں علم انسانی میں اضافہ ہوتا ہے تو یہ جادو کرامات بچوں کا کھیل لگتے ہیں۔

''کل کا غائب آج کا شہادۃ بن جاتا ہے۔''

سائنسدان زندگی اور کائنات کے آغاز کا سراغ ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں تو عالمِ امر اور عالمِ خلق کی باؤنڈری پر پہنچ کر رک جاتے ہیں۔اس سے پیچھے وہ جھانک بھی نہیں سکتے کیونکہ عدم سے کسی چیز کا وجود میں آنا ہماری عقل کے دائرہ کار سے باہر ہے۔ابتداء میں فضائے بسیط میں چھایا ہوا دُھواں Cause and Effect کے قانون میں بندھا ہے۔

سورہ سجدہ کی پانچویں آیت میں ارشاد ہے۔

یُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الۡاَرۡضِ ثُمَّ یَعۡرُجُ اِلَیۡہِ ۔۔۔۔ (32:5)

ترجمہ: ''جب اللہ تبارک وتعالیٰ کسی کام کا ارادہ فرماتے ہیں تو وہ سکیم ابتداء سے انتہا تک اللہ کے سامنے ہوتی ہے (عالم غیب والشہادۃ)۔جب یہ سکیم شروع ہوتی ہے تو انتہائی پست درجہ سے اس کا آغاز ہوتا ہے اور وقت کے ساتھ نشوونما پاکر درجہ بدرجہ اپنے نقطہ عروج کی طرف بڑھتی جاتی ہے۔''

سائنس اس کو ارتقاء یعنی Evolution کہتی ہے:

ایک تھیوری کے مطابق کائنات کی ابتداء تقریباً پونے 14 ارب سال پہلے ہوئی۔ اللہ کے تخلیق کائنات کے ارادہ کے ساتھ ہی ایک عظیم الجثہ بادل عدم سے وجود میں آیا جو کہ اس کائنات کا منبع تھا۔ قرآن اس بادل کو دُخَانٌ (41:11) اور سائنس اسے Nebula کہتی ہے۔ اس بادل کے سائز کو ہم سوچ بھی نہیں سکتے البتہ موجودہ کائنات کے طول وعرض سے اس کے حجم کا اندازہ کر سکتے ہیں اور یہ اندازہ ہمیں حیرانی کے سوا کچھ نہیں دیتا۔

Primary Nebula ابتداء میں ایٹم کے بنیادی ذرات پر مشتمل تھا۔ یہ گھوم رہا تھا۔ کشف ہو رہا تھا۔ پھیل رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے درجہ حرارت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اربوں سال کے عرصہ میں یہ خود روشن ہو گیا۔

After glow ستاروں وسیاروں اور الیکٹران کی حرکت سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ (Nebula) گھڑی مخالف سمت میں گھوم رہا تھا۔ ہمارے نظام شمسی کے سیارے بھی گھڑی مخالف سمت (Anti clockwise) میں گھوم رہے ہیں۔ چاہے یہ حرکت دوری ہو یا محوری۔

(حیران کن امر ہے کہ قدیم دور سے گھڑ دوڑ، اتھلیٹکس اور حتی کہ طواف کعبہ بھی گھڑی مخالف سمت میں ہوتا ہے۔)

اربوں سال کے ارتقاء کے بعد (Nebula) ایک زور دار دھماکے (Big Bang) کے ساتھ اربوں/کھربوں (Sec Nebula) میں تقسیم ہو گیا اور جب یہ تمام ٹکڑے خلاء میں پھیلے تو یہ Galaxies میں تبدیل ہوئے۔ ان میں سے ہر ایک گلیکسی میں اربوں، کھربوں ستارے وسیارے وجود میں آئے۔ انہی میں سے ایک ٹکڑا ہمارا Solar Nebula بنا جس سے ہمارا نظام شمسی وجود میں آیا۔ Nebula سے Earth تک کا ارتقائی سفر تقریباً 9 ارب سال میں ہوا۔

ہماری گلیکسی (Milky-way) میں تقریباً 300 کروڑ سورج موجود ہیں اپنے اپنے نظام شمسی کے ساتھ۔ یہ گلیکسی دوسری گلیکسیوں کے ساتھ مل کر Cluster بناتی ہیں اور پھر Super Cluster بنتے ہیں۔ ہماری کائنات ان سے بھری پڑی ہے۔ کائنات میں اب بھی اضافہ ہو رہا ہے۔

(يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ ۭ (35:1)) ۔ کائنات مسلسل پھیل رہی ہے۔ سائنسدان اسے Expanding Universe کہتے ہیں (51:47)

زمین جب وجود میں آئی تو یہ ایک آتشی گولہ تھی جس پر بڑے بڑے Comets و Meteoroid کی بارش ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ آتش فشاں بھی بہت زیادہ تعداد میں تھے۔ انہی میں سے کسی بڑے Meteoroid کے ٹکراؤ کے نتیجہ میں ہمارا چاند (Moon) وجود میں آیا۔ اس کائنات میں جو بھی سیارہ وجود میں آیا وہ اپنے Mother Planet کے گرد گھوم رہا ہے۔ جیسے چاند زمین کے گرد۔ زمین سورج کے گرد اور سورج اپنے تمام نظام کے ساتھ اپنے مستقر کی طرف رواں

دواں (وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ط)(36:38)۔

سائنسدانوں نے اس مستقر کو Solar Apex کا نام دیا ہے اور Constellation of Hercules میں ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے عالمِ خلق پیدا کیا تو اس کے قوانین بھی وضع کیے۔ اور اس کا نظم ونسق چلانے کے لیے کائناتی قوتیں بھی بنائیں۔ ان قوتوں کو قرآن ''ملائکہ'' اور ہم فرشتے کہتے ہیں۔ سائنس انہیں Centrifugal Force, Solar energy, Centripetal Force, Thermal Power, Gravity, Atomic Energy, Electricity, Wind Energy, Hydel Power, Eleohomagnatism وغیرہ وغیرہ کے نام سے پہچانتی ہے قرآن کے مطابق ''ملائکہ'' نظر نہیں آتے (لم تروھا) البتہ ان کے مظاہر سے ان کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو کام جس کے سپرد کیا وہ اسے تندہی سے انجام دیتا ہے۔ یہ چوں چرا ن نہیں کرتے (یفعلون مایومرون) نہ انکار کر سکتے ہیں اور نہ ہی تھکتے ہیں (وَّاَنَّهُمْ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ (5:82)) (وَمَا یَسْطُرُوْنَ (68:1)) ان کے اس طرح سرگرم عمل رہنے کو ہی ان کی ''تسبیح'' کہا گیا ہے اور یہی ان کا ''سجدہ'' ہے۔

قرآن میں ارشاد ہے کہ اللہ نے اس کائنات کو چھ دن میں پیدا کیا (54:7)، (38:50) دن بمعنی دور یا قرن اللہ نے دو دن میں زمین بنائی اور باقی چار دن میں زمین کو آباد کیا (41:9-12)

سائنس بھی اس کو چھ ادوار میں تقسیم کرتی ہے۔

پہلا $\frac{\text{دن}}{\text{دور}}$	Nebula → Big Bang	13.8 Ga	
دوسرا $\frac{\text{دن}}{\text{دور}}$	Big Bang → Earth	4.5 Ga	
تیسرا $\frac{\text{دن}}{\text{دور}}$	Haeden eon	4.5 Ga - 3.8 Ga	
چوتھا $\frac{\text{دن}}{\text{دور}}$	Archeon eon	3.8 Ga - 2.5 Ga	
پانچواں $\frac{\text{دن}}{\text{دور}}$	Proterozoic eon	2.5 Ga - 540 Ga	
چھٹا $\frac{\text{دن}}{\text{دور}}$	Phanerozoic eon	540 Ga - To Date	

تقریباً پونے 14 ارب سال پہلے زمین وجود میں آئی تو اس کی آب وہوا موجودہ زندگی کے موافق نہ تھی۔ لیکن اس وقت سمندر سے زندگی کا آغاز ہوا اور خورد بینی حیات وجود میں آئی۔ قرآن میں ارشاد ہے کہ ہم نے زندگی کو پانی (ماء) (30:21) اور چیختی مٹی (طین لازب) سے پیدا کیا۔ جب ارتقاء کے اگلے قدم پر پہلا Unicellular organism وجود میں آیا (نفسِ واحدہ) تو سمندر زندگی سے بھر گئے۔ پھر زندگی نے ایک اور جست بھری اور Uni سے Multi کی سٹیج میں داخل ہوگئی۔ اس کے بعد یہ جانور نما پودے سمندر سے نکل کر خشکی پر آئے اور پانی کے کناروں پر پاؤں جمانے لگے اس طرح ہمارا

Super Continent۔(Rochini) سرسبز ہوگیا۔

ارتقاء کے نتیجے میں spore producing پودے seed producing بن گئے۔ اس کے ساتھ ہی زمین کی آب وہوا تبدیل ہوئی۔ آکسیجن کی زیادتی ہوئی اور Ozone کی تہہ بنی۔ پودوں کے بعد جانور بھی سمندروں سے نکلے اور رفتہ رفتہ خشکی اور فضا میں پھیل گئے۔ ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے مختلف انواع واقسام کے لاکھوں جاندار وجود میں آئے اور ختم (Extinct) ہوگئے۔ ارتقاء کا اگلا زنیہ وہ ہی چڑھے جنہوں نے اپنے آپ کو اس کے قابل ثابت کیا (Survival of the fittest) اندازہ تین ارب سال بعد زمین تیسرے برفانی دور سے گزر رہی تھی۔ اس کے بعد درجہ حرارت میں اضافہ ہوا۔ فضا میں آکسیجن کی مقدار میں اعتدال آیا۔ اس دوران عظیم الجثہ اور خطرناک جانوروں سے زمین صاف ہوگئی۔ زمین مختلف براعظموں میں تقسیم ہوئی ابھی براعظموں کی اکھاڑ پچھاڑ جاری تھی تو ارتقاء کے نقطۂ عروج پر وہ ہستی معرض وجود میں آئی جس کے لیے یہ جہاں آباد کیا گیا تھا یعنی حضرت انسان یا حضرت آدم یہ سارے حفاظتی انتظامات شاید اسی لئے کئے گئے کہ انسان سے زیادہ کوئی مخلوق بھی اس سطح زمین پر Defence less نہ تھی۔ نہ پر، نہ پنجے، نہ دانت، نہ زہر۔

لیکن ارتقاء نے انسان کو جو دماغ دیا اس کا کوئی دوسرا ثانی نہ تھا۔ اس کے بل بوتہ پر نہ صرف یہ پھلا پھولا بلکہ کرۂ ارض انسان کو باقی تمام مخلوق سے الگ اور منفرد پیدا کیا گیا ایک بنیادی فرق جو انسان اور دوسری مخلوقِ خداوندی میں نمایاں ہے وہ یہ کہ انسان کے علاوہ دوسری مخلوقات مجبورِ محض پیدا کی گئی ہیں ایسا سمجھیں کہ اللہ نے ہر ایک مخلوق میں ایک Microchip لگا دی ہے اور اسے programm کر دیا ہے وہ مخلوق اس کے تحت زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ وقت پیدائش انسان کو اللہ تعالیٰ نے الوہیاتی توانائی کا ایک شمہ عطا کیا (نَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ) (32:9) اور اسی توانائی کی بدولت انسان کو اختیار ملا اور اکثر مخلوقات سے افضل قرار پایا۔ صاحب اختیار ہونے کی بدولت وہ اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے۔ انسان کو جب کائنات میں بھیجا گیا تو اس کو کچھ فرائض سونپے گئے البتہ ان کے کرنے نہ کرنے کا اختیار اس کا ہے اور اسی کا حساب کتاب ہو رہا ہے اور ہوگا۔

ارتقاء کا اگلا قدم یعنی مستقبل کی زندگی کے بارے میں اللہ نے قرآن میں تماثیل کی مدد سے سمجھایا ہے کہ وہ جاودانی زندگی، ارفع واعلیٰ ہوگی وہاں ایک مثالی معاشرہ قائم ہوگا اور اتنا کچھ ملے گا جس کا ہم موجودہ سطح زندگی پر ادراک بھی نہیں کر سکتے۔

لیکن ارتقائی قانون کے مطابق اس منزل کو صرف وہی پاسکیں گے جو پاکیزہ سیرت وکردار کے مالک ہوں گے اور اللہ کی کتاب کی روشنی میں زندگی گزارتے ہوئے اس دنیا میں ایک جنتی معاشرہ کی تشکیل کریں گے جیسا کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وصحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے کیا۔

اگلی جنت انہی کو نصیب ہوگی جو یہاں جنت بناویں گے۔

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
www.azharabbas.com

تحریک طلوعِ اسلام اقامتِ دین کی ایک واحد تحریک

ہمارے موجودہ دور میں مسلمان جس قدر، مجبور، لاچار اور زوال پذیر ہوئے ہیں تاریخ میں شاید ایسے ادوار بہت کم آئے ہیں اور یہ سب کچھ مسلمانوں کے اپنے کئے کی سزا ہے بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ (30:41) ترجمہ: لوگوں کے ہاتھوں کی کمائی ہوئی۔ اس وقت دنیا میں مسلمانوں کے پچاس سے زیادہ ممالک ہیں لیکن مسلمانوں کے ان تمام ممالک میں بھوک، افلاس، بدامنی، دہشت گردی، جہالت، تباہ حالی چھائی ہوئی ہے۔ مسلمانوں میں علمی وفکری بیداری اور قیادت کا سخت فقدان ہے۔ فکری طور پر تمام ممالک ایک قبرستان بنے ہوئے ہیں۔ کسی ملک میں کوئی جدید فکر، کوئی فکری تحریک سامنے نہیں آرہی ہے۔ حضور ﷺ کی ایک نہایت روشن حدیث ہے جس میں حضور ﷺ نے فرمایا **ومن اشتراع یوما فھو مغبون** اور جس شخص کے دو دن ایک حالت میں گزر گئے، تو وہ شخص گھاٹے میں رہا۔ آئندہ مستقبل کا دن گزشتہ دن سے بہتر ہونا چاہئے۔ اور نگاہ مستقبل پر جمی ہوئی ہونی چاہئے تاکہ مستقبل کے مسائل کا حل سامنے آتا رہے اور فکر بیدار رہے۔ قرآنِ کریم ہر زمانہ کے مسائل کا حل پیش کرتا چلا جاتا ہے۔ یہی انسانیت کے مسائل کا مشکل کشا اور حلال المشکلات ہے۔ لیکن جب آپ نگاہ ماضی پر رکھیں گے، اور پانچ چھ سو سال پرانی تصنیف کردہ کتابیں درس میں پڑھائیں گے، تو پھر اس فکر کو قرآن سے کسی مسئلہ کا حل نہیں ملے گا۔ قرآنِ کریم کتنا ہی روشن اور تابناک فکر پیش کرتا ہو، لیکن ہمارے ہاں وہ فکر اس لیے قبولیت حاصل نہیں کرتا کہ سلفِ صالحین نے یہ بات نہیں کہی تھی۔ آپ کسی بڑے سے بڑے دارالعلوم میں داخل ہوں۔ آپ ضرور یہ محسوس کریں گے کہ آپ چھ سات سو سال پرانے ماحول میں آگئے ہیں اور کوئی موجودہ تازہ فکر ان کے پاس نہیں ہے۔ جہاں تک ہمارے سیاسی لیڈروں کا تعلق ہے، ان کے لیے جس قدر کم کہا جائے اس قدر اچھا ہے۔ ان سیاسی لیڈروں میں تین خامیاں ایسی ہیں جو تمام مسلمان ممالک کے لیڈروں میں موجود ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ سارے اسلامی ممالک کے لیڈر بالکل نااہل اور فکری طور پر mediacre ہیں۔ ان میں نہ فکری صلاحیتیں ہیں اور نہ انتظامی۔ قرآنِ کریم کا حکم ہے کہ انتظامی امور کی امانات یعنی اپنا ووٹ اس کو دو جو اس کا اہل ہو (4:58) اور جو معاوضہ طلب نہ کرتا ہو (36:21) لیکن ہمارے ہاں کوئی ایسا لیڈر نہیں جو ان

امانات کا اہل ہو اور جو معاوضہ نہ مانگتا ہو۔ دوسری خامی ہمارے قائدین کی یہ ہے کہ یہ اقتدار پسند Power Hungry ہیں۔ اگر یہ ایک مرتبہ اقتدار پر آجاتے ہیں تو پھر ان کو اقتدار کا خون ایسا لگتا ہے کہ وہ اس کو کسی حال میں چھوڑنے کو تیار نہیں ہوتے۔ وہ جان دے سکتے ہیں لیکن اقتدار نہیں چھوڑ سکتے۔ پھر ان کی یہ خواہش اپنی ذات تک محدود نہیں رہتی ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ یہ اقتدار ان کے بعد ان کی نسل میں جاری رہے تیسری خامی مسلمان قیادت کی یہ ہے کہ یہ لٹیرے ہیں۔ اپنے ملک کی دولت ناجائز ذریعے سے ہڑپ کر جاتے ہیں۔ اور خفیہ خفیہ اس دولت کو باہر کے بینکوں میں محفوظ کر دیتے ہیں۔ یہ لیڈر عوام کے خادم ہونے کے مدعی ہوتے ہیں۔ یہ عوام کو نہ چھوڑنے کے نعرہ لگاتے ہیں۔ لیکن ان کا اعمال سے کوئی چیز ایسی ظاہر نہیں ہوتی جس سے ظاہر ہو کہ یہ قائدین عوام سے کوئی دلچسپی رکھتے ہیں۔

جو حالات ہم نے اوپر بیان کئے ہیں یہ کوئی انوکھے نہیں ہیں۔ آپ سب کچھ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اس وقت ہر طرف سخت مایوسی اور ایک اضطراب کی سی کیفیت ہے۔ نوجوان طبقہ، بھوک، غربت، بے روزگاری سے دوچار ہے۔ ان کو دو وقت کا کھانا نصیب نہیں ہے اور انہیں اس حالت سے باہر آنے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا ہے، اس لئے یہ مجبوراً جرائم اور دہشت گردی اختیار کر لیتے ہیں۔ جو دہشت گرد جماعتیں اقامتِ دین کا دعویٰ کرتی ہیں وہ اس طرف کھینچ کر لے جاتے ہیں۔ یہ دہشت گرد جماعتیں بھی مایوسی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ خلافت راشدہ کا قیام، ایک ایسا نعرہ ہے کہ نوجوان طبقہ اس کے گرد جمع ہو جاتا ہے۔ لیکن ایسی جماعتوں سے اسلام اور خود مسلمان سخت بدنام ہوتے ہیں۔ اس نوجوان طبقے کو ان دہشت گرد جماعتوں سے روکنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ کوئی تحریک قرآنِ خالص کو سامنے رکھ کر، پھر اقامت دین کی کوشش کرے۔ تو لوگ اس طرف خود آنے لگیں گے۔ تحریک طلوع اسلام اس دور میں واحد تحریک ہے جو اقامتِ دین کی داعی ہے۔ یہ تحریک دہشت گردی کی قائل نہیں ہے۔ اس کے نزدیک ایمان اور اعمال صالحہ سے از خود اقتدار حاصل ہو جاتا ہے (24:55) لیکن یہ بات بھی حیرت کی ہے کہ جو جماعتیں دہشت گرد نہیں ہیں اور علمی اور فکری طور پر اقامتِ دین کی داعی ہیں۔ ان کا لائحہ عمل بھی قرآن کریم کے مطابق نہیں ہے۔ اس کی وضاحت پیش خدمتِ عالی کی جاتی ہے۔

اسلامی ہیئت اجتماعیہ قائم کرنا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرائض میں شامل تھا مجموعی طور پر امتِ مسلمہ اور انفرادی طور پر ہر مسلمان پر اسلامی نظام قائم کرنا فرض ہے حضورؐ نے جو مملکت قائم فرمائی تھی وہ مملکت دس لاکھ مربع میل پر وسیع تھی۔ اتنی وسیع مملکت چونکہ ایک شخص نہیں چلا سکتا اس لیے حضور نے اس مملکت کو چلانے کے لیے مقامی نظام مقرر فرما دیئے تھے جن کو قرآنِ کریم نے اولوالامر کے نام سے موسوم کیا ہے (4:83,4:59) اور ان اولوالامر کی اطاعت کو قرآنِ کریم نے فرض قرار دیا ہے۔ جو لوگ مدینے شریف سے دور رہتے تھے اور ان کا مدینے آنا مشکل تھا وہ اپنے تنازعات و مقدمات ان مقامی حکام کے

پاس لے جاتے تھے اور ان سے فیصلہ کرا لیتے تھے اور ان کا فیصلہ ہی رسول اللہ ﷺ کا فیصلہ ہوتا تھا۔ مقامی حکام کے فیصلے کو رسول اللہ ﷺ کا فیصلہ قرار دے کر ایک تو رسول اللہ ﷺ کی ذاتی اطاعت کا تصور ختم کر دیا گیا، دوسرے نظام کی ایک عملی شکل سامنے آ گئی جس کی وجہ قرآن نے اسلامی نظام کی اطاعت کو ہی اللہ و رسول کی اطاعت قرار دے دیا تھا۔ خوب واضح رہے کہ یہ اطاعت ایک اطاعت ہے۔ اس کے لیے اگرچہ اللہ و رسول کے دو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اور مطاع بھی دو ہیں۔ لیکن اطاعت یہ ایک ہی ہے۔ اسی لئے قرآنِ کریم نے ان دو مطاعوں کے لیے اس جگہ واحد کا صیغہ اور واحد ضمیر استعمال کی ہے۔ یہ آیات ہم آگے پیش کریں گے۔ اب اللہ و رسول کی اطاعت کی عملی شکل، اسلامی نظام کی اطاعت قرار پا گئی۔ اگر کسی مقام پر اسلامی نظام موجود ہے تو وہاں اس کی اطاعت سے اللہ و رسول کی اطاعت ہو رہی ہوتی ہے۔ لیکن اگر کسی جگہ اسلامی نظام ہی موجود نہیں ہے اور وہاں نظام طاغوتی جاری ہے تو اس جگہ کسی طریقہ سے بھی اللہ و رسول کی اطاعت نہیں ہو سکتی۔ مسلمان ہونا کوئی ذہنی یا فکری چیز نہیں ہوتی بلکہ مسلمان ہونا ایک عملی چیز ہوتی ہے (4:136) اور جو کوئی شخص اس نظام کے تحت زندگی بسر کرتا ہے۔ قرآنِ کریم کے نزدیک وہ مسلمان ہوتا ہے اور جو شخص اس نظام کے تحت زندگی بسر نہیں کرتا قرآن کی رُو سے وہ مسلمان نہیں ہے (4:65، 5:44) البتہ مردم شماری کی رُو سے وہ پیدائشی مسلمان ہو سکتا ہے۔ (الحمدللہ) کہ ہم بھی ان ہی مسلمانوں میں شامل ہیں (49:14)

حضور ﷺ کے دور میں حضورؐ کی موجودگی میں حضورؐ کی اطاعت اس نظام کے ذریعے ہو رہی تھی۔ اب اصل سوال یہ پیدا ہوا کہ حضورؐ کی وفات کے بعد حضور ﷺ کی اطاعت کس طرح کی جائے۔ قرآنِ کریم کی رو سے یہ اطاعت، حضور ﷺ کے جانشین کی طرف پھرتی ہے جو ایک زندہ، محسوس اتھارٹی کی شکل میں احکامات جاری کرتی ہے۔ چنانچہ یہ اطاعت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف منتقل ہوئی اور اب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت قرار پائی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی اطاعت اللہ کی عبادت اور رسول ﷺ کی اطاعت تھی۔ کیونکہ وہ نظام جاری تھا انسانیت کی بدقسمتی کہ وہ نظام منقرض ہو گیا۔ اور ملوکیت غالب آ گئی جس کی وجہ سے اللہ و رسول کی اطاعت کا طریقہ و راستہ بھی محدود ہو گیا اس دن کے بعد سے آج تک پوری انسانیت اللہ و رسول کی اطاعت سے محروم ہے کیونکہ اس طریقہ کے علاوہ اللہ و رسول کی اطاعت کا کوئی دوسرا عملی طریقہ ہو ہی نہیں سکتا۔

یہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا صحیح طریقہ تھا جو اوپر بیان کیا گیا ہے۔ ہم مسلمانوں میں قرآن کی تفسیر حدیث کی تدوین اور سارا اسلامی لٹریچر بنو عباس کے دور میں تحریر کیا گیا ہے۔ اس دور کے خلفاء بنی عباس اس قدر آوارہ اور بدچلن تھے کہ ہمارے مفسرین کو اس بات کی جرأت و ہمت نہیں ہوئی کہ وہ ان خلفاء کی اطاعت کو اللہ و رسول کی اطاعت قرار دیتے۔ اگر

مسلمانوں کی قسمت اچھی ہوتی تو یہ مفسرین خلفاء کے خلاف مواد فراہم کرتے، اور قرآن کا صحیح تصور پیش کر کے، اس اطاعت کو حضور کے جانشین کی طرف ہی منتقل کرتے۔ لیکن ان مفسروں نے اس اطاعت کو روایات کی طرف منتقل کر دیا اور اس طرح اب اللہ و رسول کی اطاعت قرآن و حدیث کے ذریعے ہونے لگی اور یہ اطاعت اسلامی مملکت کے مرکز کی ایک اطاعت ہونے کے بجائے۔ دو اطاعتیں ہو گئیں۔ دو اطاعتیں مذہب میں ہوتی ہیں۔ دین میں اطاعتیں دو نہیں ہو سکتیں، لیکن اب بھی جو جماعتیں اقامتِ دین کی داعی ہیں وہ بھی اس ایک اطاعت کو دو اطاعتیں ہی قرار دے رہی ہے۔ اللہ و رسول کی دو اطاعتیں چونکہ قرآن و حدیث سے بخوبی ہو جاتی ہیں اس لیے پھر اسلامی مملکت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اسلامی نظام صرف اس وقت ہی قائم ہو سکتا ہے جب آپ ان دو اطاعتوں کو ایک اطاعت قرار دیں اور جب تک آپ ان دو اطاعتوں کو ایک اطاعت قرار نہیں دیتے دین قائم نہیں ہو سکتا۔ اس بارے میں قرآن کریم میں آیات تو بہت ہیں ہم اپنے موقف کی تائید میں صرف چند آیا پیش کرتے ہیں۔

(1) یہودیوں نے مدینہ میں اس عہد کو توڑا تھا جو انہوں نے حضور ﷺ سے کیا تھا اس عہد شکنی کو قرآن کریم نے ''اللہ و رسول'' کی مخالفت کہہ کر پکارا ہے کیونکہ یہ مخالفت اسلامی نظام کی مخالفت تھی۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَآقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (59:4)، ترجمہ: یہ اس لیے ہے کہ انہوں نے اللہ و رسول کی مخالفت کی اور جو کوئی اللہ (کے حکم) کی مخالفت کرتا ہے تو اللہ کا قانون سخت سزا دینے والا ہے۔

(2) اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِيْنًا (33:57)

جو لوگ اللہ و رسول کو اذیت پہنچاتے ہیں ان کے لئے دنیا اور آخرت میں ذلت آمیز عذاب ہے اور خدا کی لعنت۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص اللہ کو اذیت نہیں دے سکتا۔ یہ اسلامی نظام کے لیے کہا گیا ہے۔

(3) بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ (9:1) ترجمہ: جن مشرکوں کے ساتھ تم نے معاہدہ کیا تھا ان کے لیے اللہ و رسول کی طرف سے بری الذمہ ہونے کا اعلان کیا جاتا ہے۔

(4) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ (8:20) اے ایمان والو تم اللہ و رسول کی اطاعت کرو اور اس سے روگردانی مت کرو درآں حالے کہ تم سن رہے ہو۔ یہاں اللہ و رسول دو مطاع ہیں لیکن چونکہ اطاعت ایک ہے اس لیے واحد کی ضمیر استعمال ہوئی ہے۔

(5) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۚ (8:24) اے ایمان والو تم اللہ اور رسول کی دعوت کا جواب دو وہ جب تمہیں اس بات کی طرف بلا رہے ہوں جو تمہیں زندگی عطا کرے۔ یہاں بھی اللہ و رسول

دونوں کے لیے واحد کا صیغہ دعا کم استعمال ہوا ہے۔

(6) وَاِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ وَاِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْٓا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ (49 - 48 : 24) ترجمہ: اور جب ان لوگوں کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ ان کے متنازعہ فیہ امور میں فیصلہ کرے تو ان کا ایک فریق اس سے گریز کرتا ہے اور اگر ان کا کوئی حق کسی پر واجب ہو وہ اس کی طرف سر جھکائے ہوئے چلے آتے ہیں۔ یہاں پھر اللہ و رسول کے لیے ضمیر واحد آئی ہے مزید حوالہ جات ملاحظہ ہوں۔ 8:46،24:63، 9:107،8:13،58:5،58:20،33:36،58:8،58:21،9:62،9:74،8:20، زیادہ واضح حوالے 9:24،24:54۔

فیصلہ طلب بات یہ ہے کہ حضور ﷺ کی اطاعت روایات کے ذریعے کی جائے یا نظام کے ذریعے۔ اگر آپ رسول ﷺ کی اطاعت روایات کے ذریعے کرنا چاہتے ہیں۔ تو پھر اسلامی نظام کبھی بھی قائم نہیں ہوسکتا اور نہ ہی اس کی ضرورت باقی رہتی ہے۔

اقامتِ دین کی کوششوں میں یہ بات شامل ہے کہ اگر آپ کے نظریات مذہب کے غلبہ کی وجہ سے خالص قرآنی نہیں رہے ہیں تو آپ پر فرض ہے کہ آپ اپنے نظریات قرآن کے مطابق کریں۔ ہمارے ہاں ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ سے دین مذہب میں تبدیل شدہ چلا آرہا ہے۔ اسی وجہ سے مذہب کے زیر اثر قرآنِ کریم کی اصطلاحوں کے معنی تبدیل ہوگئے ہیں۔ اگر آپ کو مذہب کو پھر دین میں تبدیل کرنا ہے تو آپ پر لازم ہے کہ آپ قرآنِ کریم کی اصطلاحوں کا خالص دینی مفہوم اختیار کریں۔ یہ اصطلاحات تو بہت ہیں لیکن جو اصطلاح اقامتِ دین میں وجہ بنتی ہیں۔ ہم صرف ان کا ذکر شروع کرتے ہیں۔ ان میں سب سے اہم کام عبادت کا قرآنی مفہوم اختیار کرنا ہے۔ مذہب کے زیر اثر ہمارے ہاں عبادت کے معنے پرستش لیے جانے لگے ہیں۔ حضرت شیخ الہند نے قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ (39:14) کا ترجمہ: تو کہ میں تو اللہ کو پوجتا ہوں'' کیا ہے۔ ایک دوسرے مقام پر بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ (39:66) ترجمہ: نہیں بلکہ اللہ ہی کو پوج اور رہ حق ماننے والوں میں، مزید حوالہ جات ملاحظہ ہوں، 39:17، 43:45، 43:81، ان سب مقامات پر حضرت نے عبادت کا ترجمہ پوجنا کیا ہے لیکن قرآنِ کریم نے عبادت کے معنی محکومیت کئے ہیں۔ سورۃ البقرہ میں قصاص کے بارے میں ارشاد ہوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ (2:178) ترجمہ: فرض ہوا تم پر (قصاص) برابر کرنا مقتولوں میں۔ آزاد کے بدلے آزاد، اور غلام کے بدلے غلام یہاں قرآنِ کریم نے العبد کو الحر کے مقابلہ میں استعمال کیا ہے آزاد اور غلام ایک دوسرے کے مدمقابل ہوتے ہیں۔ غلام حُر کی اطاعت کرتا ہے۔ اس کا محکوم ہوتا ہے۔ کوئی غلام اپنے آقا کی

پرستش نہیں کرتا۔ عبادت کا لفظ عبد ہی سے بنا ہے۔ جس کا بنیادی معنی محکومیت اور غلامی کا ہے۔

(2) قرآنِ کریم نے عبادت کا لفظ محکومیت کے لیے استعمال کیا ہے ارشاد عالی ہے وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (18:26)، ترجمہ: وہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ یہاں عبادت کا لفظ ٹھیٹھ محکومیت کے لیے استعمال ہوا ہے۔

(3) سورہ یوسف میں ارشاد ہے اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ (12:40) ترجمہ: حکومت اللہ کے علاوہ کسی کی نہیں ہوسکتی اور اسی آیت کا دوسرا حصہ ہے اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ (12:40) اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے علاوہ کسی کی محکومیت اختیار نہ کردیں۔ اس مقام پر حکومت اور عبادت کے الفاظ مرادف المعانی استعمال ہوئے ہیں۔

(4) فرعون نے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے وہ احسانات جتائے جو اس کے بقول اس نے بنی اسرائیل پر کیے تھے تو اس کے جواب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تم جو اپنے احسانات بتا رہے ہو۔ ان احسانات میں یہ بھی شامل تھا کہ تم نے عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (26:22) ''کہ غلام بنایا تو نے بنی اسرائیل کو'' ترجمہ حضرت شیخ الہند۔ یہاں عبادت کا ترجمہ خود حضرت شیخ الہند نے محکومیت کیا ہے۔ کیونکہ اس کے علاوہ ان کے پاس اور کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔

(5) جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام نے بنی اسرائیل کی آزادی کی کوشش شروع کی تو اس بارے میں بھی فرعون نے ان دونوں حضرات کے حوالے سے کہا تھا۔ وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ (23:47) ترجمہ: اور ان کی قوم ہمارے تابعدار ہے (حضرت شیخ الہند) یہاں حضرت اقدس نے عابد کا ترجمہ تابعدار کیا ہے پرستندہ نہیں کیا۔

اسلامی نظام چونکہ اسلامی قوانین جاری کرتا ہے اس لیے اس نظام کی اطاعت ہی قوانین خداوندی کی اطاعت ہوتی ہے۔ نظام کی اطاعت کے بعد پرستش کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ پھر مخصوص پرستش گاہیں بنانے کی بھی ضرورت نہیں رہتی اس لیے کہ اسلامی نظام کی عدالتیں کچہریاں، تحصیلیں، تھانے، یہ سب مساجد اللہ ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان مقامات سے احکامات خداوندی جاری ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کے زوال کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ وہ پرستش اور اطاعت میں تفریق نہیں کرتے۔ پرستش کو بھی اطاعت خداوندی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ پرستش ہی مسلمانوں کے زوال کا سبب بنی ہے اور یہ پرستش ہی اطاعت خداوندی میں مانع ہوتی ہے۔ آپ ایک وقت میں ایک ہی چیز کر سکتے ہیں۔ اگر آپ اطاعت خداوندی کرنا چاہتے ہیں۔ تو وہ اطاعت تو صرف اسلامی نظام کی معرفت ہی ہوسکتی ہے تو آپ اسلامی نظام قائم کریں اور اگر آپ پرستش کرنا چاہتے ہیں جو آپ اس وقت کر رہے ہیں، تو آپ کو اسلامی نظام کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مگر اس دھوکہ میں نہ رہیں کہ آپ اس پرستش کے ذریعے اطاعتِ خداوندی کر رہے ہیں جس طرح دین اور مذہب ایک دوسرے کی ضد ہیں، اسی طرح اطاعتِ خداوندی اور پرستش بالکل ایک دوسرے کی ضد ہیں، اس غلط فہمی کی نشاندہی کرتے ہوئے حضرت مولانا امین احسن اصلاحی

صاحب نے فرمایا ''عبادت کسی کی کرنا، اور اطاعت کسی اور کی کرنا، دونوں باتوں میں ایک کھلا تضاد ہے جس پر صرف وہی شخص مطمئن ہوسکتا ہے جس کی عقل میں بہت بڑا فتور واقع ہوگیا ہو'' (تزکیۂ نفس، صفحہ: 347) یہی وہ بہت بڑا فتور ہے جس میں ہم مسلمان مبتلاء چلے آرہے ہیں کہ ہم پرستش اللہ تعالیٰ کی کرتے ہیں اور اطاعت اپنے ہی منتخب کردہ حکمرانوں کی۔ پرستش کے نتائج مرنے کے بعد نکلتے ہیں جن کا اس دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اطاعت کے نتائج اس دنیا میں سامنے آتے ہیں جس سے قوم ترقی کرتے کرتے بام عروج کو پہنچ جاتی ہے۔ جس قدر قوم اطاعت کرے گی، اسی قدر ترقی حاصل کرے گی اس کے بر خلاف قوم جس قدر پرستش کرے گی زوال پذیر ہوگی ارشاد ہوتا ہے وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ اَمَرْتَهُمْ لَيَخْرُجُنَّ ؕ قُلْ لَّا تُقْسِمُوْا ۚ طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (24:53) اے رسول ان (منافقین نے) خدا کی سخت سے سخت قسمیں کھائی ہیں کہ اگر تم اُنہیں حکم دو تو وہ گھر بار چھوڑ کر نکل کھڑے ہوں گے۔ کہو قسمیں نہ کھاؤ، دستور کے مطابق اطاعت اس سے بہتر ہے اور تم جو کچھ کر رہے ہو خدا اس سے خبردار ہے۔ اطاعت باتیں یا پرستش نہیں ہوتی بلکہ اطاعت ہوتی ہے۔ طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ ؕ کا مطلب یہ ہے کہ اطاعت جانی پہچانی ہوتی ہے۔ یہ معلوم اور محسوس ہو رہا ہوتا ہے کہ اطاعت ہو رہی ہے۔ اطاعت اپنے تعارف کے لیے کسی قسم کی محتاج نہیں ہوتی بلکہ عمل محسوس اپنا تعارف خود آپ ہی کرا دیتا ہے۔ چنانچہ اس آیت سے اگلی آیت میں اطاعت کے نتائج سامنے آگئے کہ ایمان اور اعمال صالحہ کا نتیجہ اس دنیا میں اقتدار حاصل ہونا، اور دین کا حکم ہوتا ہے۔ یہ ہوتا ہے اطاعت کا نتیجہ جبکہ پرستش کا نتیجہ زوال ہی زوال ہوتا ہے۔

یہاں تک یہ عرض کیا گیا ہے کہ اقامتِ دین کے لیے یہ ضروری ہے کہ آپ اللہ و رسول کی اطاعت کو ایک اطاعت قرار دیں، اور اس کی عملی شکل اسلامی نظام کی اطاعت کو قرار دیں، اور اطاعت خداوندی کو صرف اسی اطاعت میں محصور کریں اور اس کے علاوہ اطاعت خداوندی کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہوسکتا جب تک آپ اسلامی نظام کی اطاعت کو ہی عبادت خداوندی قرار نہیں دیں گے اسلامی نظام قائم نہیں ہوسکتا۔ دین میں پرستش کی اس وجہ سے گنجائش نہیں ہوتی کیونکہ قرآنِ کریم کا ہر حکم عبادت کا درجہ رکھتا ہے اور ہر عبادت حکم کا مرتبہ رکھتی ہے۔

ہمارے ہاں مختلف فقہوں پر عمل کیا جاتا ہے۔ اس سے مختلف فرقے وجود میں آتے ہیں اور قوم میں فرقہ بندی جڑ پکڑتی ہے۔ فرقہ بندی کے نقصانات پر آگے بات کی جائے گی۔ لیکن پہلے آپ فقہی قوانین کی دینی حیثیت ملاحظہ فرمائیں۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دس لاکھ مربع میل پر وسیع و عریض مملکت قائم فرمائی اور اپنی مدد کے لیے جگہ جگہ مقامی حکام مقرر فرمارہے جو اولوالامر کہلاتے ہیں۔ قرآنِ کریم اس حکومت کو اصول عطا کرتا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان اصولوں کی جزئیات مقرر فرماتے تھے۔ قرآنِ کریم نے زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم دیا لیکن اس کی کوئی شرط نہیں بتائی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دور کے لئے ایک نصاب مقرر فرمادیا تو اس مملکت کے سارے شہری اس نصاب کے مطابق زکوٰۃ ادا

کرنے لگے۔ قرآنِ کریم نے نکاح کے لیے مہر کو شرط قرار دیا ہے لیکن مہر کی رقم قرآن نے خود مقرر نہیں کی۔ حضور ﷺ نے اپنے دور کے مطابق مہر کی رقم مقرر فرما دی تھی۔ قرآنِ کریم نے نکاح کے لیے بلوغت شرط قرار دی ہے (4:6) لیکن قرآنِ کریم نے بلوغت کی عمر کو Specify نہیں کیا۔ قرآن نے مسافر کے لیے روزہ موخر کرنے کی اجازت دی ہے۔ لیکن مسافر کو Define نہیں کیا۔ حضور نے اپنے دور کے لیے اس مسافرت کو متعین کیا۔ اسلامی مملکت قرآنی اصولوں کی جو جزئیات مقرر کرتی ہے وہ اسلامی فقہ کہلاتا ہے۔ اسی طرح خلافت راشدہ میں اسلامی قانون بنتے رہے۔ ہمارے ہاں جو فقہ حنفی اور فقہ جعفری رائج ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہ اسلامی قانون ہی نہیں ہے۔ یہ ملوکیت کے وضع کردہ قانون ہیں۔ ان دونوں فقہ کا امام ابو حنیفہ اور امام جعفر صادق سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان دونوں بزرگ اور محترم شخصیات کی کوئی کتاب موجود نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اسلامی فقہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ جزئیات اسلامی حکومت مقرر کرے۔ غیر اسلامی حکومتوں کے وضع کردہ قوانین اسلامی نہیں ہو سکتے۔ بنو عباس کی مملکتیں مسلمانوں کی غیر اسلامی مملکتیں تھیں ان کے قوانین اسلامی نہیں ہو سکتے۔ یہ ہمارا موجودہ فقہ مختلف علماء کی ذاتی آراء پر مشتمل ہے۔ نہ تو انہیں کوئی تقدس sanctity حاصل ہے اور نہ ہی یہ قوانین ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وضع کئے گئے تھے۔ اس لیے ان قوانین کی بنیاد پر فرقہ بنانا اور پھر فرقہ پرستی کرنا، بالکل نقصان دہ بات ہے اور فرقہ بندی اقامتِ دین میں مانع ہوتی ہے۔ لیکن حیرت یہ ہے کہ جو جماعتیں آج کل اقامت دین کے لیے کوشاں ہیں وہ سب اپنے اپنے فقہ کو اتنی اہمیت دیتی ہیں، کہ سارے مسلمان ایک فقہ پر جمع نہیں ہو سکتے۔

اس فقہ کی وجہ سے ہی مسلمانوں میں فرقہ بندی ہے قرآنِ کریم کی رو سے فرقہ بندی شرک ہے (30:32)، فرقہ بندی کرنے والوں کا رسول اللہ ﷺ سے کوئی تعلق باقی نہیں (6:160) قرآن نے حکم دیا کہ سب مل کر اللہ کی رسی (قرآن) کو تھامے رکھو اور فرقے نہ بناؤ (3:103) اس آیت سے بہت واضح ہے کہ فرقہ بنتا ہی جب ہے جب اللہ کی رسی (قرآن) ہاتھ سے چھوڑ دی جاتی ہے۔ اس طرح فرقہ سازوں کا قرآن سے بھی کوئی تعلق نہیں رہتا۔ فرقہ بنانے سے دنیاوی زندگی میں ذلت وخواری خدا کا عذاب ہے (20:134) اس سے برکاتِ سماوی وارضی کا دروازہ بند ہو جاتا ہے (7:96)، فرقے چونکہ ہماری پیشوائیت کے بنائے ہوئے ہیں۔ اس لیے ہماری پیشوائیت اس کی مخالفت نہیں کرتی صرف یہ کہتی ہے کہ فرقوں کے درمیان رواداری رکھو۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا۔ فرقہ جب بھی بنے گا اس میں تعصب ضرور ہوگا۔ آج سارا مشرق وسطیٰ اس فرقہ بندی کی آگ میں جل رہا ہے۔ جو جماعت بھی اقامتِ دین کی داعی ہو، اسے چاہئے کہ فرقہ بندی کو شرک قرار دے کر اس کی کوئی گنجائش نہ رکھے۔

جو جماعت اقامتِ دین کے لیے اٹھے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ۔

(1) اللہ و رسول کی اطاعت کو ایک اطاعت قرار دے۔

(2) اسلامی نظام کی اطاعت کو اللہ و رسول کی اطاعت قرار دے۔

(3) اس پر واضح ہو کہ پرستش کے ذریعے عبادت خداوندی نہیں ہو سکتی۔

(4) قرآن کے ہر حکم کی اطاعت، عبادت خداوندی ہوتی ہے۔

(5) سابقہ ادوار میں وضع کردہ قوانین، یعنی ہماری موجودہ فقہ کی کوئی دینی حیثیت نہیں ہے۔

(6) فرقے مذہب میں ہوتے ہیں، دین میں فرقے بن ہی نہیں سکتے۔ دین میں تمام احکامات کی اطاعت تمام شہری کرتے ہیں اور یہ عبادت خداوندی ہوتی ہے۔

دین صرف اس وقت قائم ہو سکتا ہے جب ان شقوں پر عمل کیا جائے گا۔ تحریک طلوع اسلام وہ واحد تحریک ہے جو قرآنِ خالص پیش کرتی ہے اور قرآنِ خالص کے مطابق دین قائم کرنے کی داعی ہے۔ باقی جتنی جماعتیں اس وقت اقامتِ دین کے لیے کوشش کر رہی ہیں ان کی نہ تو سمت قرآن کے مطابق ہے اور نہ ہی وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتی ہیں۔

معزز صارف!

محکمہ ڈاک 1892ء سے لیکر آج تک اس خطے میں آپ کی خدمت کے لئے کوشاں ہے۔ ماضی میں ہر مشکل وقت میں محکمہ ڈاک نے عوام الناس کی بے پناہ خدمت کی ہے اور اُسی جذبہ کو برقرار رکھتے ہوئے ہم آپ کی مزید خدمت کرنا چاہتے ہیں موجودہ دور میں محکمہ ڈاک کو بڑے چیلنجز کا سامنا ہے۔ اس تناظر میں محکمہ ڈاک نے آپ کی خدمت کے لیے اپنا دائرہ کار وسیع کیا ہے۔ اب آپ:

- بجلی، گیس، پانی اور ٹیلی فون کے بل اپنے قریب ترین ڈاکخانہ میں جمع کرا سکتے ہیں۔
- اپنے پیاروں کے بیرونِ ملک سے بھیجے گئے پیسے ویسٹرن یونین کے ذریعے مقرر کردہ ڈاکخانوں سے وصول کیے جا سکتے ہیں۔
- رقم کی منتقلی اب برقی اور فیکس منی آرڈر کے ذریعے فوری طور پر ممکن ہے۔
- ارجنٹ میل سروس کے ذریعے اپنی ڈاک پورے ملک میں پہنچائیں۔
- وی۔پی۔ پارسل/ لیٹر کے ذریعے اپنے کاروبار کو مزید مستحکم کر سکتے ہیں۔
- اپنی پوری عمر کی جمع پونجی اور بچت قریب ترین ڈاکخانے میں سیونگ بنک میں جمع کروا سکتے ہیں۔
- آپ سے التماس ہے کہ آپ قریب ترین ڈاکخانہ میں تشریف لا کر خدمت کا موقع دیں۔

شکایات کے ازالے کے لیے مندرجہ ذیل فون نمبرز پر صبح 09:00 بجے سے شام 08:00 بجے تک رابطہ کر سکتے ہیں۔

Ph:042-99210971, 042-99239794 Cell:0321-6772525, 0335-6161400
Fax: 042-99211323 Email: ccpmgpunjab@yahoo.com

نوٹ: یہ اشتہار محکمہ ڈاک پنجاب کی طرف سے دیا جا رہا ہے۔

آپ کے تعاون کے لیے شکر گزار محکمہ ڈاک

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یکے از مطبوعات باغبان ایسوسی ایشن

باغبان ایسوسی ایشن کا ماٹو ''قرآن فہمی اور باغبانی'' ہے۔

باغبانوں کے غیر رسمی مقامی اجتماعات ہر ماہ کی 15، 30 تاریخ کو ہوتے ہیں جن میں وہ اپنے تجربات ومشاہدات پر مشاورت کرتے ہیں۔

ہمارا پروگرام ''باغبان یَنۡفَعُ النّاس کمپلکس'' کا قیام ہے۔

غلامی:۔ آسان سے آسان اور سادہ سے سادہ الفاظ میں انسانی تکریم یہ ہے کہ جہاں چھوٹی یا بڑی کسی بھی شکل میں غلامی موجود ہو وہاں انسانی تکریم کی تذلیل ہوگی۔ کوئی مذہبی دکان کتنی ہی خوبصورت اور دھوم دھام والی کیوں نہ ہو وہاں تکریم اور تذلیل کا موازنہ کرنا ہوگا۔ اسلام اور غلامی بالکل متضاد رُخ معاشرہ پیش کرتے ہیں۔

علامہ اقبالؒ اس کا ایک معیار یوں سامنے لاتے ہیں۔

از غلامے لذّتِ ایماں مجو
گرچہ باشد حافظِ قرآں مجو

اور اس تصویر کا دوسرا رخ یوں نمایاں کرتے ہیں۔

کس دریں جا سائل ومحروم نیست
عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

ہفتہ شجر کاری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔

لوگ بڑی بڑی تحقیقات کے دعوے کرتے ہیں۔ آپ قلم اور کاغذ لیکر اپنے اپنے معاشرے کا مشاہدہ کریں۔ غلامی کی شکلوں کو نوٹ کرتے جائیں آپ پر ایسے حقائق منکشف ہوں گے جو آپ کے خواب وخیال میں بھی نہ تھے۔ غلامی کی ہر شکل کو مٹانا قرآنی غایت الغایات ہے۔ اس لئے وہ انسان کو ''عِبَادِیۡ'' کہہ کر پکارتا ہے۔ انسان کو اللہ کا بندہ بنانا سب سے بڑی سنت رسول ﷺ ہے۔ اللہ کا بندہ ''اللہ اکبر''، ''اللہ اکبر''، ''اللہ اکبر'' کی صدائے دلنواز کا گرویدہ ہوتا ہے۔ والسلام

ملک حنیف وجدانی صدر باغبان ایسوسی ایشن سنبل سیّداں نیو مری موبائل نمبر 0310-1547355

غلام احمد پرویز

(قسط اوّل)

تحریک طلوعِ اسلام کا تعارف

(بانیٔ تحریک کے الفاظ میں)

تقسیم سے قبل گو طلوع اسلام کا مقصد تحریکِ پاکستان کی تائید تھا لیکن اس کی یہ تائید دورِ حاضرہ کی اصطلاح یا مفہوم میں ایک ''سیاسی مقصد'' کے حصول کے لئے نہیں تھی۔ طلوع اسلام کا مؤقف قرآنی تصور کی ہمنوائی میں یہ تھا کہ اسلام ایک دین (یعنی نظامِ مملکت) کی شکل میں اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے جب مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت ہو جس میں قرآنی اقدار کی حکمرانی ہو۔ اس طرح یہ حصولِ پاکستان کی سیاسی جنگ کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کو ذہنوں میں جاگزیں کرتا چلا گیا کہ اسلام کا مقصود کیا ہے اور دین کا مطمحِ نگاہ کیا' وہ کس قسم کا ضابطۂ زندگی اور نظامِ حیات پیش کرتا ہے اور وہ ضابطہ یا نظام کس طرح دیگر نظامہائے حیات سے منفرد اور بے مثال ہے۔ وہ کیوں کسی اور ضابطہ سے مفاہمت نہیں کر سکتا اور اس میں کیوں کسی اور نظام کا پیوند نہیں لگایا جا سکتا۔

نظامِ خداوندی کو ایک آزاد خطۂ زمین پر مشہود کرنے کی یہی وہ حسین آرزو اور مقدس تمنا تھی جس کو لے کر حصولِ پاکستان کے بعد طلوع اسلام پھر جادہ پیما ہوا۔ اس کے نزدیک حصول مملکت کے بعد سب سے پہلا کام یہ تھا کہ دین کے جن امور کو وہ اب تک اصولی طور پر پیش کرتا چلا آیا ہے ان کے تمام پہلوؤں پر تفصیلی روشنی ڈال کر اس کے نمایاں خط و خال امت کو دکھائے اور قرآن ہی کی روشنی میں اس کے قیام کی موجودہ عملی صورت کا تعین کرے۔ طلوع اسلام کے پیشِ نظر دوسرا کام یہ تھا کہ وہ تمام سلیم قلب' سعید روحیں اور جو قرآنِ کریم کے اس حیات آفریں پیغام سے ہم نوا ہیں لیکن کسی مرکز کے نہ ہونے کے سبب تسبیح کے بکھرے ہوئے دانوں کی طرح ایک دوسرے سے بے خبر اطراف و جوانبِ ملک میں الگ الگ پڑی ہیں اور باوجود ہزار بار سوچنے کے آگے قدم نہیں اٹھا سکتیں کہ وہ اس میدان میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتی ہیں انہیں یک دلی اور ہم مشربی کے رشتۂ محکم میں منسلک کر کے ایک ذہنی مرکز پر جمع کر لیا جائے اور اس طرح ان افراد کے اجتماع سے وہ قافلہ مرتب ہو جائے جس کا ہر قدم صحیح منزل کی طرف اٹھے۔

جہاں تک قرآنی نظامِ زندگی کے خط و خال کا تعلق ہے اس کی تفصیل طویل ہے اور اس مختصر وقت میں اسے پیش کرنا دشوار۔ محترم پرویزؔ صاحب نے اس کو وضاحت کے ساتھ رسالہ طلوع اسلام کے ہزارہا صفحات اور بیسیوں کتابوں کی شکل میں

نقش کر کے انہیں ملک میں عام کر دیا ہے اور جن کا چرچا آپ چہار اطرافِ عالم میں سنتے ہیں لیکن مختصر طور پر پرویز صاحب نے جو طلوع اسلام کے مقصد کی وضاحت میں پیش کیا ہے' یہ ہے:

(1) دین کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں سے خالص قوانین خداوندی کی اطاعت کرائے اور اس طرح کوئی انسان دوسرے انسان کی محکومی اور غلامی میں نہ رہے۔ خواہ یہ غلامی ذہنی اور فکری ہو اور خواہ طبعی اور اقتصادی۔

(2) قوانینِ خداوندی کی اطاعت ایک نظام کی رو سے ہو سکتی ہے جسے استخلاف فی الارض (یا نظامِ مملکت) کہتے ہیں۔ قرآن کی رو سے استخلاف فی الارض کے بغیر دین کا تمکن ہو ہی نہیں سکتا۔

(3) قرآن نے (بجز مستثنیات) دین کے اصولی قوانین دیئے ہیں اور اسے اس نظام پر چھوڑا ہے کہ وہ ان اصولوں کی روشنی میں اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق جزئیات خود متعین کرے۔

(4) رسولؐ اللہ نے سب سے پہلے نظامِ قرآنی قائم کیا اور اپنے رفقائے کار (صحابہ کبار رضی اللہ تعالیٰ عنھم) کے مشورہ سے قرآن کے اصولی احکام کی جزئیات مرتب فرمائیں۔

(5) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد دین کا یہی نظام حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنھم نے جاری رکھا جو امورِ ملت کو ملت کے مشورہ سے سرانجام دیتے تھے۔ قرآن کے جن اصولوں کی جزئیات اس سے پہلے متعین نہیں ہوئی تھیں انہوں نے ان کا تعین کیا جن میں کسی ردوبدل کی ضرورت تھی ان میں ضروری تغیر و تبدل کیا' جن میں ایسی ضرورت نہیں تھی انہیں علیٰ حالہٖ باقی رکھا۔

(6) بدقسمتی سے خلافت علی منہاجِ نبوت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد منقطع ہو گیا اور دین کا قرآنی نظام باقی نہ رہا' اس سے امت میں انتشار پیدا ہو گیا جس میں ہم اس وقت تک مبتلا ہیں۔ اب کرنے کا کام یہ ہے کہ پھر سے اسی انداز کا نظام قائم کیا جائے جو امت کو قرآن کے مطابق چلائے۔

(7) جب تک اس قسم کا نظام قائم نہیں ہوتا امت کے مختلف فرقے' جزئیات پر جس جس انداز سے عمل پیرا ہیں کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ان میں کسی قسم کا ردوبدل کرے۔ یہ حق صرف قرآنی نظام کو پہنچتا ہے کہ وہ ان اختلافات کو مٹا کر پھر سے امت میں وحدت پیدا کرے۔ اس دوران میں اتنا ہی کیا جا سکتا ہے کہ دین کے اس تصور کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے اور ہم میں جو عقائد و رسومات ایسی رائج ہو چکی ہیں جو قرآن کے خلاف ہیں ان کی طرف توجہ دلائی جائے تاکہ جو لوگ قرآن کے مطابق زندگی بسر کرنے کا جذبہ اپنے اندر رکھتے ہوں وہ اپنی اصلاح کرتے چلے جائیں۔

(8) قرآن تمام نوعِ انسانی کے لئے واحد اور مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ اس کے ساتھ وحی کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ لہٰذا نہ قرآن کے بعد خدا کی طرف سے کوئی اور کتاب آ سکتی ہے' نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کوئی اور نبی یا رسول۔

(9) قرآن کا ہر دعویٰ علم پر مبنی ہے اور اس کے حقائق زمان و مکان کی حدود سے ماوراء۔ قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اپنے زمانہ تک مختلف علوم وفنون جس حد تک ترقی کر چکے ہیں وہ سب انسان کے سامنے ہوں اور چونکہ قرآن کا ارشاد ہے کہ یہ تمام کائنات انسان کے لئے تابع تسخیر کر رکھی ہے اس لئے خدائی پروگرام کو پورا کرنے کے لئے کائناتی قوتوں کی تسخیر لاینفک ہے۔

(10) نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مقدسہ' شرفِ انسانیت کی معراج کبریٰ کی مظہر تھی لیکن بدقسمتی سے ہماری کتب روایات و تاریخ میں ایسی باتیں شامل ہوگئی ہیں جن سے حضور ﷺ کی سیرت داغدار ہو کر سامنے آتی ہے۔ آپ کی سیرتِ طیبہ کا جو حصہ قرآن کے اندر محفوظ ہے اس کے قطعی اور یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصہ جو قرآن کے باہر ہے سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے یا جس سے حضور ﷺ پر کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے تو وہ بات ہمارے نزدیک وضعی ہے اور حضور ﷺ کی طرف غلط منسوب۔ ضرورت ہے کہ سیرتِ نبویؐ کے صحنِ چمن سے ان کانٹوں کو الگ کر دیا جائے۔ جو روایات نہ قرآن کے خلاف ہیں اور نہ ہی ان سے حضور ﷺ کی سیرتِ مقدسہ پر کسی قسم کا حرف آتا ہے انہیں ہم صحیح مانتے ہیں۔

(11) ہم دین میں فرقہ سازی کو شرک سمجھتے ہیں اس لئے ہم کوئی فرقہ پیدا نہیں کرنا چاہتے' احکامِ اسلامی کے متعلق البتہ ہم یہ ضرور کہتے ہیں کہ ان کی پابندی محض ایک رسم کے طور پر نہیں کرنی چاہئے بلکہ ان کی روح پر بھی نگاہ رکھنی چاہئے۔

(12) قرآنی نظام کا مقصود یہ ہے کہ انسان کی مضمر صلاحیتوں کی پوری پوری نشوونما ہو جائے تاکہ نوعِ انسانی اس زندگی میں سر اٹھا کر چلنے اور اس کے بعد کی زندگی میں شرفِ انسانیت کے باقی مراحل طے کرنے کے قابل ہو سکے۔

(13) قرآنی نظام میں تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری معاشرہ پر ہوتی ہے اس اہم فریضہ کی ادائیگی کے لئے ضروری ہے کہ وسائل پیداوار معاشرہ کی تحویل میں رہیں نہ کہ افراد کی ذاتی ملکیت میں جس میں معاشرہ کوئی دخل نہ دے سکے۔ یاد رہے کہ یہ تصور کمیونزم یا سوشلزم کے تصور سے یکسر مختلف ہے جس میں انسان کی طبعی زندگی کے علاوہ کسی اور زندگی کا تصور ہی نہیں ہوتا۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن کا نظامِ ربوبیت نہ سرمایہ داروں کے لئے خوش آئند ہو سکتا ہے نہ کمیونسٹوں کے لئے۔

یہ تھے دینِ خداوندی کے وہ خط وخال جنہیں طلوع اسلام ..... نہایت مستقل مزاجی سے عوام کو دکھاتا رہا اور یہی تھی آہن کی وہ فسان جس سے ریت میں ملے ہوئے فولادی ذرات تڑپ تڑپ کر ریت سے الگ ہو گئے اور کہکشانی ستاروں کی طرح اس حیات آفریں پکار پر کھنچے چلے آئے۔

انہی افراد پر مشتمل تنظیمی ہیئت کا نام ''بزم طلوع اسلام'' ہے۔ ان بزموں کا مقصد اور مشن طلوع اسلام کی طرف سے

پیش کردہ قرآنی فکر کو عام کرنا ہے۔

قرآنی پیغام کے عام کرنے کے سلسلہ میں ہمارے سامنے یہ حقیقت آئی کہ جب کوئی شخص جذبات سے مغلوب ہو جائے تو وہ کوئی معقول بات سننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ وہ اس موڈ میں ہی نہیں ہوتا کہ پیش آمدہ مسائل پر عقل و بصیرت کی رو سے غور کرے اور دلائل و براہین کے مطابق کسی فیصلے پر پہنچے۔ افراد کے مجموعے ہی کا نام قوم ہوتا ہے ور جب اقوام بھی جذبات کے سیلاب میں بہہ جائیں تو یہی چیز ان کی تباہی کا موجب بن جاتی ہے۔ اس وقت ہماری قوم بھی تباہی کے اسی غار کی طرف رواں دواں چلی جا رہی ہے اور بری طرح جذبات کے سیلاب میں بہی جا رہی ہے۔ یوں تو مغرب کی خدا فراموش سیاست کی بدولت انتخابات کی وبا ہر جگہ آندھی بن کر اٹھتی اور جھکڑ بن کر چھا جاتی ہے۔ لیکن ہمارے یہاں بدقسمتی سے اس نے اور ہی شکل اختیار کر لی ہے۔ یہاں ایک طبقہ انسان کی طبیعی ضروریاتِ زندگی کے حصول کو اپنا مطمح نظر بنائے ہوئے ہے اور صرف اسی میں انسانیت کے فلاح و بہبود کا راز بتاتا ہے اور اس کے حصول کے لئے وہ اپنی ہر چیز کو داؤں پر لگائے بیٹھا ہے۔ دوسری طرف نظریۂ پاکستان کے مخالفین عوام کے ان جذبات کو مشتعل کرنے میں پوری شدت سے سرگرمِ عمل ہیں جن کا تعلق قلبِ انسان کے نہایت نرم و نازک گوشوں سے ہوتا ہے۔ ان حالات کے پیشِ نظر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تحریکِ طلوعِ اسلام کے مقاصد کو ایک بار پھر دہرا دیا جائے۔ یہ ضرورت اس لئے اور بھی اہم ہو جاتی ہے کہ تحریکِ طلوع اسلام دینِ خداوندی کے فروغ اور نظامِ ربوبیت کے قیام و عمل کی پیامبر ہے ان حالات میں ایک طرف مذہب پرست طبقہ ہم سے متقاضی ہے کہ 'دین خطرہ میں ہے۔ اس لئے آپ ہمارے ساتھ مل کر ان کا مقابلہ کیجئے۔ دوسری طرف سرمایہ داری کے ظلم و استبداد اور مذہبی پیشوائیت کی خون آشامیوں' عیاریوں اور مکاریوں کا شکار طبقہ ہم سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ تم نظامِ ربوبیت کے پیامبر ہو اس لئے سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کو دفن کرنے میں ہم سے تعاون کیوں نہیں کرتے۔ تیسری طرف تحریک میں شامل وہ نئے نوجوان ہیں جن کی بے تابیٔ تمنا دبی زبان سے یہ شکوہ کرتی ہے کہ قرآن کے نظامِ ربوبیت کے قیام کے لئے ہماری موجودہ رفتار نہایت سست ہے۔ اس کے لئے ہمیں باہر نکلنا چاہئے۔ سوشل ورک کر کے ہمیں عوام کی ہمدردیاں حاصل کرنی چاہئیں اور یوں عوام کی طاقت حاصل کر کے غیر قرآنی نظامِ کہن کی جگہ دینِ خداوندی کا نفاذ کرنا چاہئے۔

اندریں حالات' ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ تحریکِ طلوع اسلام کے مقاصد' نصب العین اور اس کے حصول کے لئے طریقِ کار کو مختصر طور پر خود بانیٔ تحریک کے الفاظ میں پیش کر دیں۔

دستور اساسی و اصولی ہدایات برائے بزمہائے طلوع اسلام کی پہلی شق یہ ہے:۔۔

''بزمِ طلوع اسلام نہ کوئی سیاسی پارٹی ہے نہ مذہبی فرقہ' یہ ایک اجتماعی کوشش ہے اس قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے لئے جسے ادارۂ طلوع اسلام کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ

اسلام میں جو غیر قرآنی تصورات شامل ہو گئے ہیں، انہیں الگ کر کے پھر سے اس نظام کی تشکیل کے لئے فضا سازگار بنائی جائے جو عہد محمد رسول اللہؐ والذین معہٗ میں قائم ہوا تھا۔''

چنانچہ طلوع اسلام کی پہلی کنونشن منعقدہ ۱۹۵۶ء میں محترم پرویز صاحب نے اپنے خطاب میں فرمایا:

''اس کے بعد میں اس کے دوسرے گوشے کی طرف آتا ہوں جو اس پہلے گوشے سے بھی زیادہ نازک اور لطیف ہے۔ لطیف اتنا کہ بعض اوقات اسے صحیح طور پر سمجھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ گوشہ یہ ہے کہ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت اور اس کے ذریعے معاشرہ میں انقلاب بغیر گروہ بندی اور پارٹی بازی کے برپا کیا جائے۔ چونکہ دور حاضرہ میں معمول یہ ہے کہ کوئی تحریک بغیر پارٹی بازی کے وجود میں نہیں آتی اس لئے یہ بات ذرا مشکل سے سمجھ میں آ سکتی ہے کہ پارٹی بازی کے بغیر بھی کوئی تحریک چل سکتی ہے۔ لیکن برادران! قرآن کریم سے جو کچھ تھوڑی بہت بصیرت میں نے حاصل کی ہے اس کی روشنی میں، میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ملت کے اندر تعمیری انقلاب پیدا کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ کوئی پارٹی بنائے بغیر ان میں فکری تبدیلی پیدا کرتے جائیں..... قرآن کریم غیر مسلموں کے مقابلہ میں مومنین کو الگ جماعت، ایک جداگانہ امت قرار دیتا ہے لیکن وہ اس امت کے اندر فرقہ سازی کو شرک قرار دیتا ہے، بعض احباب کہتے ہیں کہ قرآن مذہبی فرقہ کو تو شرک قرار دیتا ہے، سیاسی پارٹی کو شرک نہیں ٹھہراتا، ذرا سوچئے کہ جس اسلام میں مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے ہی نہیں اس میں مذہبی فرقہ اور سیاسی پارٹی میں کیا فرق ہو سکتا ہے؟ لہٰذا مذہبی فرقہ ہو یا سیاسی پارٹی دونوں تفریق فی الدین ہیں۔ پھر کہا یہ جاتا ہے کہ جو مقصد ہمارے سامنے ہے اس کے لئے اجتماعی کام کی ضرورت ہے، انفرادی کوششوں سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ اگر پارٹی بنانا منع ہے تو یہ اجتماعی کام کس طرح سے ہو سکے گا۔ یہ اجتماعی کام منظم کوشش (Organised Effort) سے ہو سکے گا۔ اب سوال یہ پیدا ہو گا کہ پارٹی بازی اور منظم کوشش میں کیا فرق ہے؟ اس فرق کو سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔ قرآن نے تحزب (پارٹی بازی) کی نفسیات کو چند الفاظ میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے جہاں کہا ہے کہ: كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (30:32)۔ پارٹی کی عمارت تعصب کی بنیادوں پر اٹھتی ہے اور دوسروں سے نفرت کے جذبہ پر استوار ہوتی ہے۔ ہر پارٹی کے ممبر یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا بھر کی سعادتیں اور حسنات ان کی پارٹی میں جمع ہیں اور پارٹی سے باہر جتنے لوگ ہیں ان میں کوئی خوبی اور نیکی نہیں۔ اس سے ان کے اندر نخوت اور تکبر پیدا ہو جاتا ہے اور وہ دوسروں کو سخت ذلت اور حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ لیکن انہی ذلیل اور حقیر لوگوں میں سے جب کوئی ان کی پارٹی میں شامل ہو جاتا ہے تو وہ ہر قسم کے شرف و مجد کا حامل بن جاتا

ہے۔ پھر اس میں دنیا بھر کی خوبیاں آ جاتی ہیں۔ اگر وہ پارٹی کے ساتھ وفا شعار (Loyal) رہتا ہے تو اس کا ہر عیب ہنر دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اگر اس نے پارٹی سے قطع تعلق کر لیا تو نہ صرف یہ کہ اس کی ہر خوبی عیب بن جاتی ہے بلکہ دنیا بھر کے عیب اسکی طرف منسوب کر دیئے جاتے ہیں اور اسے جی بھر کر بدنام کیا جاتا ہے۔ یہی وہ ڈر ہے جس کی وجہ سے لوگ پارٹیوں کے ساتھ متمسک رہتے ہیں۔ اپنی پارٹی کی تقویت ہر رکن کا اولین فریضہ ہوتا ہے اور اس کے لئے ہر قسم کا جائز و ناجائز حربہ استعمال کرنا عین جہاد سمجھا جاتا ہے۔ دوسروں کی بات کتنی ہی معقول کیوں نہ ہو، وہ اسے کبھی نہیں سنتے اور اگر کبھی مجبوراً سننا پڑے تو اس کا تمسخر اڑاتے اور استہزاء کی ہنسی ہنستے ہیں۔ ان کی مجلسوں کا محبوب ترین مشغلہ دوسروں کی تذلیل و تحقیر ہوتا ہے، جس میں وہ بڑی لذت لیتے ہیں..... یہ ہیں وہ عناصر جن سے ایک پارٹی ترتیب پاتی اور قائم رہتی ہے۔ لیکن قرآنی نظام کے لئے منظم کوشش کا تصور اس سے یکسر مختلف ہے۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے قرآنی نظام کی حقیقت کو سمجھ لیا ہے اور جن کی آرزو یہ ہے کہ یہ نظام پھر سے ملت میں متشکل ہو جائے، وہ سب سے پہلے اس کی بنیادی خصوصیات خود اپنے اندر پیدا کریں اور پھر اس نظام کے تصور کو دوسرے لوگوں تک پہنچائیں۔ اس نظام کا بنیادی اصول یہ ہے کہ دنیا میں تمام افرادِ انسانیہ کی ضروریات زندگی پوری ہوں اور ان کی مضمر انسانی صلاحیتوں کی مکمل نشوونما ہوتی جائے۔ اس نظام کے متشکل کرنے والوں کا فریضہ یہ ہے کہ وہ دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیں اور دوسروں کی نشوونما میں اپنی ذات کی بالیدگی اور ارتقاء کا راز سمجھیں۔ ظاہر ہے کہ جو افراد اس مقصد کے حصول کے لئے منظم کوشش کرنے کے لئے اٹھیں، ان میں پارٹی بازی کی لعنتوں میں سے کسی کا شائبہ تک بھی نہیں ہوگا۔ وہ دوسروں سے نفرت نہیں، ہمدردی کریں گے۔ وہ ان کی بہبود کا سامان مہیا کرتے پھریں گے۔ وہ اس میں اپنے اور پرائے کی کوئی تمیز روا نہیں رکھیں گے۔ وہ اپنے کام کی ابتدا بے شک کسی ایک مقام سے کریں گے لیکن پوری نوعِ انسانی ان کی برادری اور ساری دنیا ان کا گھر ہوگی۔ ان کی مساعی، خدا کی صفتِ رب العالمینی کی مظہر ہوں گی۔ اس میں ان کے ذمہ زیادہ سے زیادہ ایثار اور قربانیاں ہوں گی اور دوسروں کے لئے بیش از بیش نفع بخشیاں اور راحت سامانیاں''۔

ایک دوسرے مقام پر پرویزؒ صاحب نے فرمایا:

''قرآنِ کریم اس نظام کے قیام کے لئے ذرائع بھی کوئی ایسے استعمال نہیں کرنے دیتا جو مستقل اقدار کے خلاف ہوں، اس کے نزدیک جس طرح غلط راستہ صحیح منزل تک نہیں پہنچ سکتا، اسی طرح غلط ذریعہ سے صحیح مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ وہ ذریعہ اور مقصد میں فرق ہی نہیں کرتا''۔

(جاری ہے)

ماہنامہ طلوعِ اسلام کی نئی قیمت

2016ء میں ''طلوعِ اسلام'' کا زرِ شرکت درجِ ذیل ہے

اندرون ملک:

فی پرچہ: 50 روپے	سالانہ: 550 روپے	بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک: 800 روپے

بیرونِ ملک:

سالانہ: 2500 روپے	بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک: 4000 روپے

ہماری کوشش رہتی ہے کہ طلوعِ اسلام کو خوب سے خوب تر کیا جائے جس کا اندازہ آپ کو بھی ہوگا پاکستان میں چھپائی کا سامان روز بروز مہنگا ہونے کی وجہ سے ہمیں دو تین سال بعد مجبوراً زرِ شرکت میں اضافہ کرنا پڑتا ہے تاکہ آمدن اور اخراجات میں توازن پیدا کیا جا سکے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ '' طلوعِ اسلام '' اب آن لائن ہماری ویب سائٹس اور سوشل میڈیا جیسا کہ فیس بک، ٹوئٹر وغیرہ پر بھی فری دستیاب ہوتا ہے۔ دنیا بھر کے قارئین بلا قیمت اِس کو انٹرنیٹ کے ذریعے پڑھتے ہیں۔ اس صورتِ حال میں آپ کے تعاون کی مزید ضرورت ہے تاکہ یہ سلسلہ خوش اسلوبی سے چلتا رہے۔

اِدارہ طلوع اسلام کے بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات درجِ ذیل ہیں

Bank Account Idara Tolu-e-Islam

For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465-22-003082-7

For International Transactions
IBAN: Pk21 NBPA 0465 0022 0003 0827
Swift Code : NBPAPKKAA02L

National Bank of Pakistan Main Market, Gulbarg Lahore

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ نمبر 2، لاہور۔ 54660، (پاکستان)
E-mail: idarati@gmail.com فون: 042-35714546

Surah *Al-Infitaar* (الانفطار) – *Durus-al-Qur'an Parah 30*: Chapter 16

By G. A. Parwez

(Translated by: Dr. Mansoor Alam)

My dear friends, today is September 14, 1984. And we are going to continue with verse 18 of Surah *Al-Infitaar* (الانفطار). In this single verse is contained the essence of the entire teaching of the Quran. From this you can very well understand how important this verse is. It was said before: يَّصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ (82:15) – they will find themselves in hell on the Day of Judgment. But what is this Day of Judgment? وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ (82:17) – And what could make thee conceive what that Judgment Day will be [Asad]?

يَوْمُ الدِّيْنِ (*Yaumuddin*) is mentioned in the preamble, the very first chapter of the Quran: مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ (1:4). This is usually translated as "the Lord (or Owner) of the Day of Judgment." The problem with this translation is that it gives the impression that the Quran is talking about the Day of Judgment of the Hereafter, not of this world. But the Quran has been sent as guidance for human beings in *this* world. It is alright that there will be judgment in the Hereafter. But that is after this life. But the Quran has come to guide us here, in this world. The Quran teaches how to live life in this world. The first thing in this regard is to determine what is the relationship of يَوْمُ الدِّيْنِ (*Yaumuddin*) with this life? يَوْمُ الدِّيْنِ (*Yaumuddin*) is not just the Day of Judgment as is usually translated. It also means a system of life in this world as the Quran makes it absolutely clear. The Quran does not leave anything to our imagination that we can take any meaning we want. The Quran determines its own meaning. For example, it has made it clear that يَوْمُ الدِّيْنِ (*Yaumuddin*) will happen in this world and (*Yaum*) means period or age when الدِّيْنِ (*Al-din*) prevails. الدِّيْنِ (*Al-din*), the Quranic system of life does not exist in real life in this age anywhere in this world. The religious priesthood thinks only on the outward appearance and external rituals to judge whether or not one fits their definition of religion. But the Quran says: هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (9:33: 48:28) – It is He who sent His messenger with the divine code, which is a *system* of life based on absolute truth. It will thus overcome all other man-made systems.

الدِّيْنِ (*Al-din*) means system of life

All the systems in the world – whether political, economic, or social – are man-made systems. These are different components of what we normally refer to as

system of life – a holistic system what the Quran calls using all-encompassing term of الدِّیْنِ (*Al-din*). You can see my Lughat-ul-Quran how I have provided the proof for this meaning of الدِّیْنِ (*Al-din*) – as a holistic system of life – from authoritative Arabic lexicons and from different verses of the Quran. Allah sent a guidance – a system of life – based on *the* absolute truth (الْحَقِّ) so that it prevails over all other systems of life. Please note that الدِّیْنِ (*Al-din*) is not religion as is usually translated but it is a complete *system* of life. It cannot be compared to any religion. All the debates that occur and our religious scholars try to prove that superiority of the religion of Islam is out of place because Islam is not a religion, but الدِّیْنِ (*Al-din*). The word مذہب (*Mazhab*) – normally translated as religion – does not appear in the Quran. The term الدِّیْنِ (*Al-din*) includes all aspects – political, social, economic, etc… – of life and it is bound to prevail over all other systems of life in *this* world. So, we are talking about the world systems here; and in the beginning of chapter 1 itself the Quran mentions that its system will has the unique that in this system the sole sovereign authority will be Allah. In all other systems in the world there is always a human or a group of humans who assume this role. But this is considered شرک (*Shirk* or partnership) by the Quran. This we are told right in the beginning of the Quran.

No ruler no ruled, no dependent nor deprived

My dear friends, the characteristic of الدِّیْنِ (*Al-din*) is that no one will have authority in this system except Allah. This will be the period in which Islam will prevail as الدِّیْنِ (*Al-din*) and Allah will be the sole and exclusive sovereign authority. I mentioned that the essence of الدِّیْنِ (*Al-din*) is this verse (82:15). What is this essence of the teaching of the Quran? What is its purpose? And for whom is this teaching intended for? Let me mention it again for your understanding that Quran's teaching is that it starts from human beings. And the essence of its guidance is to preserve the dignity of human beings; it is to preserve the equality of human beings; it is to make sure that all human beings are treated with equal dignity. The sign of recognition whether or not a period is following the system of الدِّیْنِ (*Al-din*) is that no human being will be dependent on another human being in this period; that no human being will be under the rule of anyone or any group of human beings in this period. The only way to preserve the dignity of human beings is to make sure that no one is

dependent on anyone else for his basic needs. According to Iqbal this will be the heavenly society when this happens. In such a society:

No human will be dependent; no one will be dispossessed;
No human will be a sovereign, no one would be governed!

This will be the real brotherhood of humankind. Everyone will have equal dignity. The only way everyone will have equal dignity will be when there is no one top and when no one is deprived. This will be the real equality of humankind. Beyond that everyone's performance will be judged on individual merit but the dignity of a person will not be linked with merit but only by being human.

The competition in society will be based only on merit

My dear friends, it is only based on deeds and actions that humans will be judged as to whose actions are good and whose actions are bad; but all would have equal dignity based on being human. This was the system of الدِّیْن(*Al-din*) that was established by the Prophet (PBUH) during the first period of Islam and it did prevail over all the other systems of that time. You very well could imagine the level of human brotherhood and dignity when Omar (R) used to greet Bilal (R) as reverend. I presented this contrast because according to this new touchstone no was as meritorious as Bilal. Also, imagine that these Arabs were deeply steeped in racial superiority among themselves who cared less about any non-Arab let alone a slave; and that too who was freed by them. However, Omar the Caliph of all people used to call this freed slave a reverend because of his abilities.

The difference between *Malukiyyah* and *Khilafah*

Umru bin 'Aas was governor of Egypt. Omar (R) the Khalifa after finding out that Umru bin 'Aas has built a waiting area in front of his house wrote him a letter with his famous phrase: Ibn 'Aas! Since when you started making people slaves whom their mothers had given birth free. Omar (R) did not want to have even a semblance of disrespect for common people like a separate waiting room removed from the main office that served them. That was the case then. But when the *Mulukiyyah* – generally known as kingship – took over then what happened? From material point of view everything went up – wealth, power, comforts of life etc. But what was the foundation of الدِّیْن (*Al-din*) – the dignity and self-respect of humankind at large – got demolished. Universal human respect disappeared; ruler-ship and subject-ship came back. Rulers stated

declaring themselves sultans and kings and the rest became their subjects and ordinary human beings. On the backs of such titles power is grabbed; kingdoms are created; and humans are subjugated. So, this way, when human dignity got demolished, humans were chained in all kinds of chains by these kings and sultans in order to perpetuate their rule.

Collusion between priesthood and kingship

Kings colluded with religious priesthood to secure their iron grip on the masses by decoupling the Sharia with politics. Kings became the rulers of the human world and the religious leaders became the rulers of the spiritual world accountable to no one. All their fatwas were delivered in the name of God. To kill someone kings had to concoct something against that person but to kill someone all what the religious priesthood needed to do was pronounce a fatwa of *Murtad* (مرتد) against him and it will become obligatory for him to be killed by anyone according to the Sharia. No warrant, no trial, no court, etc. is required. This kind of power was not available even to the kings. What to say of religious priesthood's power and authority! Even kings were subject to its authority. Priesthood could make and break kings. There was no question of Allah's sovereignty and authority – that system did not remain. And in its place came *Mulukiyyah*, the worst kind of human rule over humans bringing along with it all kinds of human chains. How well someone has said: I do not know what kind of net is that and what kind of seeds they are. All I know is that I am chained from head to toe. My dear friends, Muslims have been chained from head to toe by kingship and priesthood. And those chains – physical, psychological, religious, emotional etc. – consciously or subconsciously continue until today.

Meaning of Quranic terms was changed

When the man-made system came in place of الدِّيْن (*Al-din*) and when theocracy or priesthood got embedded with it – then don't ask what kinds of human chains came along with it. And then all the Quranic terms like – مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ (1:4) translated usually as "the Lord (or Owner) of the Day of Judgment." – were shifted to the Hereafter so that there is no الدِّيْن (*Al-din*) here in this world; so that Allah is removed from the world; so that He is no longer the مٰلِكِ (the ruler) of this world. But the Quran does not leave anything open-ended. It says: وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ (82:17) – And what could make thee conceive what that Judgment

Judgment Day will be [Asad]? Again it says again: ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ (82:18) – And once again: What could make thee conceive what that Judgment Day will be [Asad]? When will the الدِّيْنِ (*Al-din*) be established in this world who better that Allah can tell? And what its attribute will be who can tell it better than Allah? So, what would be the unique attribute of this الدِّيْنِ (*Al-din*)? يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ۭ وَالْاَمْرُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ (82:19) – [It will be] a Day when no human being shall be of the least avail to another human being: for on that Day [it will become manifest that] all sovereignty is God's alone [Asad].

All these talk of Islamic system, Islamic society, Islamic laws, Islamic state; and Islamic whatnot – my dear friends, these all the different chains of deceptions of theocracy and priesthood. But all these chains will disappear on that day. That will be the day when everyone will see his deeds in front of him. Neither will anyone will be able to do anything for the other; nor would one have any authority over the other. All power and authority will rest with the divine laws; and only these laws will prevail. In other words, human being will never be subservient to anyone, nor will he be needy. No one will be able to save any criminal for the punishment for his crime. This will be period of الدِّيْنِ (*Al-din*). *Allahu Akbar*! One cannot even imagine this kind of freedom.

Humans are thirsty for true freedom today

My dear friends, humans are in quest for freedom. So far, they have reached until democracy in politics. This is also a form of *Mulukiyyah* in which instead one person a group of persons control the destiny of others. Human beings become subservient to this group. People become slaves to the 51%. Even now, humans have not come out of the chains of other humans although they have reached the moon and beyond. Saadi said some 600 years ago:

Have you solved the problems of the Earth?
That you are focusing your energy on the Sky!

Problems of the Earth include not just individual problems but the problems associated with nations – problems of nations under the iron grips of other nations; problems of deprived and dependent nations; problems of subjugated nations. What has Islam and الدِّيْنِ(*Al-din*) got to do anything under these circumstances; could Islam and الدِّيْنِ(*Al-din*) exist within these circumstances. The Quran says that the sign of الدِّيْنِ (*Al-din*) if it exists anywhere is that no human being would have authority and control over any other human being.

The period of الدِّيْنِ (*Al-din*) will be governed solely by the laws of Allah

Now when no human being or group of human beings has authority over other human beings then would there be chaos all around? Would there be no laws in the society? No government? My dear friends, this is the Quran. As soon as the Quran says that no human being or group of human beings has authority over other human beings it cleared the matter by saying: وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ (82:19) – for on that Day [it will become manifest that] all sovereignty is God's alone [Asad]. In that period the rule, the authority, the laws – will be solely of Allah's. And the authority of Allah on Earth is: مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (2:170) – What Allah has sent down, the Quran. Allah does not want to exercise His authority like a dictator who gives orders at his whims. Allah wants to rule according to laws – and these laws are holistic and unchangeable contained in His Book, the Quran. Allahu Akbar! Such an Almighty, the creator of the Universe, is constraining Himself by saying that His laws are complete and unchangeable and even He having the power over everything will not change them? لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ؕ (10:64) – We will not change Our laws. And We have completely protected it: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (15:9) – We have, without doubt, sent down the Message; and We will assuredly guard it (from corruption) [Yusuf Ali]. This complete, protected, and unchangeable document, the Quran, will be the constitution and guidance during this period; it will be the sovereign authority during this period. This then will be Allah's sovereign authority through His Book the Quran.

The greatest achievement of our period is touted to be the rule of law rather than the rule of humans. But, in reality, it is still the rule of humans as the rules are made by humans. Humans do not give orders in this system but they give orders through the laws made by those in authority. All the chains that have been put on common humans are through these laws crafted by the powerful and elite whatever their form. The Quran says that lawmaking by humans is out of the question. It says that they do not have such authority of making laws for other human beings. The Quran gave complete and unchangeable set of laws that when implemented becomes الدِّيْنِ (*Al-din*). This is Islam. This will then be the rule of Allah; and through which His exclusive obedience is to be done without any human partnership or interference. No human will have any authority in this system. Everyone will be subject to Allah's authority. Did you

notice what الدِّيْنِ (*Al-din*) is? – that what is called Islam or Islamic what its characteristics are? If any human authority or man-made laws are included with the laws of Allah then it becomes شرک (*Shirk*); it will not be توحید (*Tauheed*); it becomes non-Islamic. That is why the Quran says: وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (18:26) – He allots to no one a share in His rule! [Asad]. Allah does not include anyone in His governance.

My dear friends, to make it absolutely clear that no human being without any exception has a share in his governance Allah says in the Quran that even His prophet does not have the authority to say to his followers to obey his authority instead of Allah's. This is يَوْمُ الدِّيْنِ (*Yaumuddin*). This is Islam. If any human being is denigrated is a system then it is not Islam. Let us recall some events that occurred with the very able governor of Egypt Umru bin 'Aas during Khalifa Omar's time. Umru bin 'Aas told someone a hypocrite. Immediately he was asked by Khalifa Omar to apologize to the person because calling him hypocrite had disgraced him. In another incident getting irritated with a Jew Umru bin 'Aas told him: May God disgrace you. Immediately he realized his mistake and turned in his resignation to Khalifa Omar writing that I am not fit for governorship as I have disgraced a human being. Khalifa Omar persuaded him to take back his resignation but he refused saying that a person is unfit to be governor who cannot control himself during trying moments. But, nowadays we see a situation where fatwas are pronounced daily about infidelity (*Kufr*). But in the period of يَوْمُ الدِّيْنِ (*Yaumuddin*) these things don't happen. Now we can appreciate what is يَوْمُ الدِّيْنِ (*Yaumuddin*)? وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ (82:17) – And what could make thee conceive what that Judgment Day will be [Asad]? ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ (82:18) – And once again: What could make thee conceive what that Judgment Day will be [Asad]? So, what would be the unique attribute of this الدِّيْنِ (*Al-din*)? يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ۭ وَالْاَمْرُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ (82:19) – [It will be] a Day when no human being shall be of the least avail to another human being: for on that Day [it will become manifest that] all sovereignty is God's alone [Asad]. *Allahu Akbar*! What a beautiful ending of this Surah *Al-Infitaar* (الانفطار).

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

O our Sustainer! Accept our humble efforts because you are fully aware of what we speak and what is hidden in our hearts. (2:127)

FOUNDED IN 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL NO. 28
VOL.69
ISSUE
3

Monthly

TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546 , 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com
web:www.toluislam.com www.facebook.com/talueislam/

